Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

NOVEL BAHAW: A GLIMPSE OF THE CONTINUOUS STRUGGLE FOR HUMAN SURVIVAL

Muhammad Idrees
PhD Urdu Scholar National College of
Business Administration and Economics Multan
Email: muhammadidrees537@gmail.com

Muhammad Zahid Gul
PhD Urdu Scholar National College of
Business Administration and Economics, Multan
Email: muhammadzahidgul@gmail.com

Prof. Dr. Rafia Malik
Department of Urdu, National College of
Business Administration and Economics Multan
Email: rafiamalik7151@gmail.com

ABSTRACT

Mustansar Hussain Tarar is a great prose writer of Pakistan who has rapidly reached the heights of fame in Urdu literature in the present era due to his creative aspects. He has proven his creative abilities in important genres of literature like column writing, travel writing, drama writing, and Novel writing. The greatest quality of a successful novelist is that his creative art is constantly evolving. Since the novel is the name of the interpretation of human life and human life is not as simple and easy as it seems. And then the realities of human life are not in their essence as they seem. After creating one novel, a novelist has to be reborn to create another novel. Life has to be seen from a new angle and perspective. The more closely an event or scene is viewed, the more complex and hidden paths open up. The insight and vision of a great creator also works like a 360-degree camera. Mustansar Hussain Tarar's novel writing is so diverse on an intellectual and artistic level that it can be clearly felt that he has traveled centuries to write each of his novels. The novel Bahav is such a different and unique novel that it introduces us to a Mustansar Hussain Tarar who does not feel like a man of today, but rather a man of a civilization centuries ago. Who has probably spent many centuries in the embrace of sleep and has waited for the time when, after going through the evolutionary stages of human civilization and winning the struggle for survival, it has acquired the ability to subjugate the entire universe. So that today's modern man can be shown a glimpse of the life of his ancestors when they were at the mercy of nature in the difficult and dark journey of survival. Their settlements were destroyed many times and then rebuilt. By doing this, he wants to make people feel the value of humanity. Of course, they are people from thousands of years ago and are fluent in a language that has become extinct over time and has become a thing of the

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

past. But their effort to recover this language, this culture, this civilization and civilization is a great effort to force today's developed man to look back at his past and examine his actions and stop his negative intentions that are causing deadly destruction for the survival of humanity. In this novel, Mustansar Hussain reveals many layers of human civilization and culture that are thousands of years old and makes us realize that human life has been fighting a continuous battle for its survival on this planet. This is a long story of continuous struggle that makes today's man think a lot and take a critical look at his activities. It invites us to take a look. The presentation of human characters, civilization, and history in this novel. The glimpse of the ancient rivers of India, the importance of water, and the reflection of the customs and relationships of ancient humans are the qualities that place this novel among the most important novels in the history of Urdu literature.

Keywords: Mustansar hussain tarar, Bahaw, Civilizatio, Interpretation, Evolutionary stages, Stuggle, Survival, Subjugate, Glimpse, Ancestors, Mercy of nature, Negative intensions

مستنصر حسین تارڑ نے جو ناول " بہاؤ " کی صورت میں تخلیق کیا اس میں ان کے ناول نگاری کے فن کا طوطی بول رہا ہے۔ کسی مخصوص عہد کی تہذیب و تاریخ کو ایک ناول میں سمیٹنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بہت کم ناول نگار ایسے ہیں جنہوں نے تاریخی و تہذیبی ناولوں کی تخلیق کے ذریعے اپنے تخلیقی فن کا لوہا منوایا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ناول " بہاؤ " کی تخلیق کے ذریعے قدیم ہندوستان کی تہذیب وتاریخ کو زندہ کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ انہیں اس ناول کی تخلیق کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آٹھ سال لگے۔ انھوں نے پنجاب کے جنوبی علاقوں خصوصاً چولستا ن کی سرزمیں پر قدیم تہذیب کی باقیات کو بہ طور ثبوت اکٹھا کرنے میں بڑی جدوجہد کی اور تب جا کر وہ ایسا کامیاب ناول تخلیق کرنے میں کامیاب رہے۔ اس ناول کا عنوان انتہائی معنی خیز ہے اور ناول کے موضوع اور ناول نگار کے نقطہ نظر کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

پانی انسانی زندگی کی سب سے اہم اکائی اور بنیادی ضروریات میں سے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ کسی خطے میں جب پانی کی قلت ، قحط کی صورت حال پیدا کر دے تو وہاں کی زندگی کو کس طرح اپنی بقا کے لالے پڑ جاتے ہیں ۔ اس صورت حال کو مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں بڑی چابکدستی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان ناول کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کے ہاں وقت کا فطری بہاؤ ہے جو بناتا اور کچلتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا ہے اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا فارمولا چلتا چلا آرہا ہے ۔ جو اپنے آپ کو مستحکم کر لے گا چٹان بنا لے گا وہ وقت کی زد سے بچ نکلے گا ورنہ معدومیت مقدر ہو گا ۔ " (۱)

بہاؤ کی بستی ایک علامتی بستی ہے اور سب کے لیے نوشتہ دیوار ہے اگر

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

زوال کو روکنے کی صلاحیت نہیں ہے تو فنا اور معدومیت آپ کا مقدر بن جائے گی ۔ انسان فطرت کا قیدی بن کر معدوم کا سفر اختیار کر لیتا ہے مگر یہ انسان کے شایان شان نہیں۔ اپنے وجود ، شناخت اور ہونے کی جنگ ہی انسان کو عظمت دلاتی ہے ۔ اسے امر کرتی ہے۔ یہ ناول اس تاریخی حقیقت کو فلسفہ حیات بنا کر پیش کرتا ہے جو وقت کے بہاؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ معدومیت کے شکنجے سے بچ نکلتے ہیں ۔ وہ جو خود کو بہاؤ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں فنا ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ناہید قمر بہاؤ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

”بہاؤ اپنے قاری کو یہ بتا تا ہے کہ زوال دراصل فنا کی وہ اندھی لہر ہے جو ظلم ، ظالم اور مظلوم سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بہاؤ کی کہانی صرف ایک بستی کی نہیں بلکہ انسانی زندگی عروج و زروال کی مقامیت یا مفرد واقعیت کی پابند نہیں ۔ “ (۲)

اس لحا ظ سے بہاؤ صرف ہزاروں سال پرانی ایک بستی کا نوحہ نہیں بلکہ یہ علامت ہے ہمارے آج کے عہد کی ہر بستی کی ، ہر قوم کی ، ہر خطے کی جو خود کو وقت کے بہاؤ کے ساتھ چلنے کی ترغیب نہیں دے پاتے اور معدوم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ناول بہاؤ کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس ناول کے تمام کردار اپنے وقت اور تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ کرداروں کے نام بھی ایسے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کے کسی پرانے دور کی بات جاری ہے ۔ گجرو ، مامن ، ناگری ، گیرو ، پکلی ، ورچن ، دھروا ، مامن ماسا ، پورن ، پاروشنی ، سکرا ، ڈروگا یہ تمام نام ہمارے لیے اپنی اجنبیت اور مایوسیت کی لہر میں پروئے ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر یہ احساس جاگتا ہے کہ یہ اسی عہد کے کردار ہیں جس کی یہ نمائندگی کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کمال طریقے سے کردارد نگاری کے فن کو نبھاتے ہوئے ان کرداروں جو زبان دی ہے وہ اس عہد اور اس تہذیب کی زبا ن معلو م ہوتی ہے جس کی تصدیق ماہر لسانیات بھی کرتے ہیں۔ پاروشنی ، روچن ، سمرو اور ڈورگا اس ناول کے اہم ترین کردار ہیں جب کہ پکلی ، دھروا اور پورن کے کردار بھی نمایاں ہیں۔

ورچن اس بستی کا نوجوان ہے جو گاگھرا کنارے آباد ہے ۔ ایک چھوٹی سی بستی جس کے باسیوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے ۔ جس کا دارومدار یا تو بارش کے پانی پر ہے یا پھر دریا کے موسمی پانی پر ۔ اس بستی کے باشندے سفر کو اچھا نہیں سمجھتے اور مشکل سے ہی کوئی بستی سے باہر نکل کر دنیا کے بارے میں حقائق تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے ۔ پورن ان چند لوگوں میں سے ہے جو بستی سے نکل ہندوستان کے طول وعرض میں ایسی بستیوں کا تلاش کرتے ہیں جو انسانوں نے آباد کیں ۔ اسی تلاش میں ورچن موہنجو تک جا پہنچتا ہے اور وہاں پورن نامی نوجوان ا سے پناہ دیتا ہے۔ ورنہ موہنجو کے رہنے والے کسی بھی اجنبی

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

کو دیکھتے ہی مار دینے کے قائل ہیں ۔ پورن ورچن کو بتاتا ہے کہ یہاں کے قدیم رہنے والے اپنے آلکس کی وجہ سے باہر آنے والوں کی قتل و غارت کا نشانہ بنتے ہیں ۔ کیوں کہ ان لوگوں خود کو وقت کے ساتھ بدلا نہیں اور اپنے رہن سہن کو جدید نہیں بنایا ۔ ڈورگا اس قدیم دور میں بھی اس استحصالی نظام کی نمائندگی کرتا ہے ۔ اس کے اجداد صدیوں سے ایک اینٹوں کے بھٹے کی چار دیواری میں قید چلے آرہے تھے اور خوراک کے بدلے اینٹیں بناتے تھے ۔ آج بھی سینکڑوں ڈورگا موجود ہیں جو اسی استحصالی نظام کی قید میں ہیں۔

پارشنی اس بستی کی ایک باشعور اور حساس لڑکی ہے۔ مدرسری سماج میں عورت کو مرکزیت حاصل تھی وہ جنسی تعلق قائم کرنے سے لے کر شادیاں کرنے اور قطع تعلق کرنے تک تمام امور میں خود مختار تھی ۔ پاروشنی بھی بیک وقت دو نوجوانوں کی محبت میں گرفتار ہے۔ دونوں سے جنسی تعلق قائم کر چکی ہے۔ ورچن سے شادی کے بعد سمرو کے ساتھ بھی تعلق استوار کیے ہوئے ہے۔ دوسری اہم بات اس کی اپنی مٹی سے محبت ہے ۔ یہ جان کر بھی کہ اب دریا کے اندر پانی کے آنے امکانات معدوم ہو چکے ہیں اور بستی کے سارے لوگ جا چکے ہیں وہ اپنی مٹی کو چھوڑ کر جانے کی ہمت پیدا نہیں کر پاتی اور بالآخر اسی مٹی میں مل جاتی ہے۔ سمرو ایک سیدھا سادہ نوجوان ہے ۔ وہ مٹی اور دھاتوں کے اوزار بناتا ہے۔ پکلی برتن بناتی ہے اور ساتھ ہی مٹی کے کھلونے بھی بناتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ فنِ مصوری سے بھی واقف ہے ۔ برتنوں کے ساتھ ساتھ وہ کھلونوں پر بہت خوبصورت بیل بوٹے اگاتی ہے۔ مجموعی طور پر ایک بہترین ناول ہے جس میں ہمیں مصنف قدیم دور میں انسانی بقا کو درپیش چیلنجز کیطرف متوجہ کرتے ہوئے موجودہ دور میں انسان کی منفی سرگرمیوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ایک کامیاب ناول نگار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا تخلیقی فن مسلسل ارتقاء پذیر رہتا ہے۔ چونکہ ناول انسانی زندگی کی ترجمانی کانام ہے ،اور انسانی زندگی اتنی سادہ اور آسان نہیں جتنی بظاہر آتی ہے،اور پھر انسانی زندگی کی حقیقتیں اتنی سادہ اور آسان نہیں جتنی کہ بظاہر نظر آتی ہیں ۔ایک ناول نگار کو ایک ناول تخلیق کرنے کے بعد دوسرے ناول کی تخلیق کے لیے ایک طرح سے نیا جنم لینا پڑتا ہے۔ زندگی کو ایک نئے اور مختلف زاویے سے اور نقطہ نظر سے دیکھنا پڑتا ہے قریب اور دورسے کیمرے کی آنکھ سے کسی منظر کو دیکھا جائے تو مشاہدات کے سامنے آنے سے تاثر کے تضادات ہم کئی بار ٹی وی سکرین سے دیکھ چکے ہیں۔ کسی واقعہ یامنظر کوجتنی باریک بینی سے دیکھا جائے اتنی ہی پیچیدہ اور پوشیدہ تہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ایک عظیم تخلیق کار کی بصیرت اور بصارت بھی360کے ایک کیمرے کی طرح مشاہداتی تنوع کی حامل ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی ناول نگاری فنی وفکری سطح پر اتنی متنوع ہے کہ صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے ایک ناول سے دوسرے ناول کے درمیان شاید صدیوں کاارتقائی سفر طے کیا ہے تباہی وہ اتنے منفرد ناول تخلیق کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ناول ’’بہاؤ‘‘مستنصر حسین تارڑ کا ایک ایسا مختلف اور منفرد ناول ہے جوکہ ہمیں ایک ایسے مستنصر حسین تارڑ سے متعارف کرواتا ہے جو آج کاانسان نہیں بلکہ صدیوں پہلے کی تہذیب کاانسان محسوس ہوتا ہے۔جس نے شاید گزشتہ کئی صدیوں کو نیند کی آغوش میں گزراہے اور اس وقت کا انتظار کیا جب انسانی تہذیب کئی ارتقائی مراحل سے گزر کر اور زندگی کی بقاء کی جدوجہد سے نکل کر ساری کائنات کو مسخر کرنے کی صلاحیت حاصل کرچکی ہو اور پھر اس وقت کے انسانوں کوان کے آباؤ اجداد کی اس زندگی کی جھلک دکھائی جائے جب وہ زندگی کی بقاء کے لیے قدرت کے نظا م کے رحم وکرم پر تھے اور ان کی بستیاں کئی باراجڑتی ،تباہ ہوتی اور پھرنئے سرے سے آباد ہوتی تھیں۔ وہ ایساکرکے انسان کو انسانیت کی قدر کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ یقیناً وہ ہزاروں سال پہلے کے انسان ہیں اور اس زبان پر دسترس رکھتے ہیں جووقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہوکرقصہ پارینہ بن گئی۔ لیکن اس زبان ،اس ثقافت اور تہذیب وتمدن کی بازیافت کی ان کی یہ کاوش آج کے ترقی یافتہ انسان کو اپنے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنے اور اپنے اعمال کاجائزہ لینے پر مجبورکرنے اور اپنے منفی عزائم سے روکنے کی زبردست کوشش ہے۔

اگرچہ ادب کی ہرصنف میں کسی نہ کسی تہذیب کے رنگارنگ عکس دیکھے جاسکتے ہیں مگرناول کا پھیلاہوا دامن اپنے اندر جتنے جلوےسمیٹ لیتا ہے اس کا امکان کسی اور صنف میں نہیں۔ پھر ایک ایسی زبان کے ناول جو ملک کے کسی ایک خطے میں محدود نہ ہوں بلکہ ہر علاقے میں پہنچ کر وہیں کی ہورہی ہو اور پھر آزاد انہ طورپر پھلنے پھولنے لگے۔اس کی وسعتوں کااندازہ لگانا مشکل نہیں۔ناول’’بہاؤ‘‘ ہماری قدیم تاریخ بھی ہے اور تہذیب بھی۔ ہماراماضی بھی ہے اور روایت بھی۔ انسان نے جب روئے زمین پر قدم رکھا تو اس کا سامنا ایک اجنبی ماحول سے ہوا۔ اس کے لیے نہ تو ماحول موافق تھا اور نہ حالات۔انسان کی زمین پر گزری ہزاروں سال کی تاریخ انسانی بقاء کی جدوجہد کی ایک دردناک کہانی ہے۔ جس کی ایک جھلک ہمیں ناول بہاؤ میں نظر آتی ہے۔

اردو میں تاریخی ناول نگاری کوئی نئی بات نہیں بلکہ اردو میں تاریخی وتہذیبی ناول کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اردو میں ناول کی اپنی تاریخ۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ سے قبل ناول نگاروں نے اردو میں جتنے بھی تاریخی اور تہذیبی ناول تخلیق کیے ان ناولوں میں اس دور کی تہذیب و ثقافت، زبان اور فضا کی پیشکش اس قدر معنی خیز نہیں رہی جتنی کہ ’’بہاؤ‘‘ کاخاصہ ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ناول’’بہاؤ‘‘ اس موضوع پر لکھے گئے ناولوں میں ایک ممتاز حیثیت کاحامل ناول ہے۔جوہمیں ماضی کے دریچوں میں گم ہوکر اس دور کی تہذیبی فضا میں سانس لینے کی قوت عطا کرتا ہے۔

ہندوستان میں دراوڑ قوم آریاؤں کی آمد سے بہت قبل کی آباد تھی۔ یہ لوگ انتہائی پسماندہ اور باقی ماندہ دنیا سے کٹے ہوئے اور الگ زندگی گزار رہے تھے۔ آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کا سامنا ایک گنوار اور پسماندہ قوم سے

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ہواجواپنے قرب وجوار کے سوادنیا کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتی تھی ۔آریا ایک مختلف تہذیب کے لوگ تھے اور وہ دنیا کے دور دراز خطوں سے ہجرت کرکے ہندوستان داخل ہوئے تھے۔ انہیں خطرات کا مقابلہ کرنے اور وسائل پر قبضہ کے لیے خطرناک سے خطرناک مہم جوئی کی عادت تھی۔وہ گھوڑوں پر سواری کرتے اور نہایت تیزرفتار سے سفرکرتےتھے۔ ان کے پاس تانبے اور کانسی کے اوزار اور ہتھیارہوتے۔ دراوڑ انسانی ذہن کی اس ترقی اور ارتقاء سے کوسوں دورتھے جو آریا حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے طول وعرض میں دشوار گزار راستوں سے گزر کر سرسبز علاقو ں تک پہنچنا اور ہندوستان کے کئی علاقوں میں آباد دراوڑوں کی بستیوں کو ملیا میٹ کرکے وہاں آباد ہونا ان کا معمول تھا۔ دراوڑ جدید طریقہ ہائے آبپاشی اور تعمیرات سے نابلد تھے دوسرا وہ سفر سے بھی خوف محسوس کرتے تھے ، یہی ان کی پسماندگی کی بنیادی وجوہات تھیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول کابنیادی موضوع بھی دراوڑوں کی یہی پرانی بستیاں اور ان بستیوں میں بسنے والوں کی اس دور کی بودوباش ہے۔ دوسری طرف آریاؤں اور دراوڑوں کے درمیان تہذیبی کشمکش کی عکاسی بھی انہوں نے بھرپور طریقے سے کی ہے۔

ناول کا آغاز ہمیشہ ناول کے عنوان سے ہوتا ہے ،اور ساتھ ہی ناول کی کامیابی اور ناکامی میں ناول کے عنوان کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ماضی میں جتنے بھی ناول مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچے وہ سب کے سب ناول منفرد اور اچھوتے عنوان کے حامل تھے۔مثال کے طور پر ابن الوقت ،امراؤ جان ادا، بستی ، آنگن، خدا کی بستی ،راکھ ، آگ کا دریا اور اداس نسلیں۔ یہ سب کے سب ایسے ناول ہیں جن کے عنوانات ناول کی کہانی اور مصنف کے نقطہ نظر کی تفہیم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ناول میں زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے لیکن اس سلسلے میں ہر ناول نگار کا اپنا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے۔ ناول میں ایک ناول نگار اپنی کہانی کو کئی ایک طریقوں سے بیان کرتا ہے کبھی کبھی ناول نگار ناول کی کہانی کو خود بیان کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ کسی کردار کے ذریعے اپنی کہانی کوسامنے لاتا ہے ۔ہرادیب کا اپنا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے اور وہ اپنے ناولوں کے عنوان کاانتخاب کرتے ہوئے دراصل اپنے نقطہ نظر کی طرف اشارہ کرتاہے۔

مستنصرحسین تارڑ کے ہاں بھی یہ خوبی موجود ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں عنوان اور نقطہ نظر میں رشتہ استوار کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ خصوصاً اس ناول کے عنوان کے انتخاب میں انہوں نے بڑی فہم وفراست کامظاہرہ کیاہے۔ پانی زندگی کی علامت اور ان چند عناصر میں سے ایک ہے جوکہ اس کائنات کی تخلیق میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً کرۂ ارض پر حیات کی پیدائش اور بقاء پانی کی مرہونِ منت ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان نے جب سے قدم رکھا اس کو اپنی بقاء کے لیے شدید جدوجہد کرناپڑی ہے۔ اس کو کئی ایک طرح کے چیلنجز کاسامنا کرنا پڑا جن میں سے سب سے ایک بڑا چیلنج پانی کی بروقت اور مناسب مقدار میں ضرورت کے مطابق فراہمی بھی شامل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس

Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

لحاظ سے اس ناول کا عنوان ''بہاؤ'' رکھ کے اس ناول کی تاریخی اور تہذیبی حیثیت واضح کردی ہے، اور پھر کہانی اس انداز میں ترتیب دی ہے کہ یہ ناول انسان کی قدیم تہذیب کی بازیافت کی ایک کامیاب کوشش قرار پاتا ہے۔

ہرکہانی کسی نہ کسی مرکزی خیال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ناول میں کہانی کی ایک خاص بنیاد ہوتی ہے جوکہ اس کو کسی مخصوص دھارے میں بندھنے کا باعث بنتی ہے۔ ہرکہانی اور کہانی کار کے یہاںالگ الگ اور منفرد مرکزی خیال ہوتے ہیں۔ عظیم الشان صدیقی ناول کے مرکزی خیال کے بارے میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں؛

''یہ کائنات بہت وسیع ہے۔ کسی ایک ناول میں اس کے تمام پہلوؤں کااحاطہ کرنا ممکن نہیں اس لیے وہ زندگی کے چند پہلوؤں کاانتخاب کرتا ہے ،اور ان پہلوؤں کے بارے میں جو اس کی رائے ہے وہی اس ناول کا مرکزی خیال کہلاتا ہے۔''(۳)

عظیم الشان صدیقی کا یہ نقطہ نظر اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ اگر ایک ناول نگار ہر پہلو کو مرکزی درجہ دینے لگے تو ناول ،ناول نہ رہے بلکہ ناول داستان ہوجائے گا۔ ناول کے موضوع اور مواد وکہانی کے بارے میں قاری کو صحیح معلومات بھی حاصل نہ ہوسکیں گی۔ کہانی کب اور کس مسئلہ سے شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی یہ بھی معلوم نہ ہوسکے گا۔مستنصر حسین نے اس ناول میں جومرکزی خیال پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اس کرۂ ارض پرقدم رکھنے کے بعد سے بقا کی شدید جنگ لڑنا پڑی اور خوراک و پانی کے حصول کو اس بقاکی جنگ میں کلیدی حیثیت حاصل رہی اور انسانی بستیوں کے آباد ہونے اور اجڑنے کے بہت سے اسباب میں سے ایک اہم سبب پانی رہا ہے ۔ اس ناول کی تمام کی تمام کہانی اسی مرکزی خیال کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس بات کے انہوں نے اپنے اس ناول میں کئی ایک اشارے اور ثبوت فراہم کیے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

''ہربرس پانی کے گرد ایک دائرہ بن جاتا تھا جہاں تک پہلے پانی تھا اور اب سوکھ چکا تھا ۔ایسے دائرے پھیلتے ہوئے رُکھوں کے اندر تک جاتے تھے کہ پانی بھی تو وہیں تک تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس مقام پرپرندے صرف مرنے کے لیے آتے ہیں اور دوردورسے آتےہیں۔ ان کے مردہ جسم گلتے سڑتے اور ان کی بُو رُکھوں کے اندر تک جاتی پر وہ سب ایک ہی جگہ پر گرتے اور یوں ان کی ہڈیوں کا ٹیلا سابن گیا تھا۔''(۴)

اس اقتباس میں صاف طور پر دیکھاجاسکتا ہے کہ کسی مخصوص علاقے میں پانی کی قلت پیدا ہونے سے حیات کوکس طرح موت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔دریا کا پانی خشک ہورہا تھا۔ پرندے پانی کے آثار دیکھ کر اترتے لیکن پانی کی بجائے کیچڑ پاتے اور پیاس بجھانے کی جدوجہد میں وہیں مرکھپ جاتے عظیم الشان صدیقی قصہ پن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ؛

''ناول حقیقت نگاری کا فن ہے اس میں جو قصہ بیان کیا جاتا ہے اسے حقیقی یا حقیقت سے قریب تر ہی ہونا چاہیے۔'' (۵)

دراصل قصہ کی کوئی شکل نہیں ہوتی کہانی کار کی کہانی اور ہوسکتی ہے

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

اور قاری کی قیاس اور ہوسکتی ہے ۔ ناول ایک نثری صنف ہے جس کی بنیاد کہانی پر ہے۔ کہانی ناول کی روح ہے اس کے بغیر ناول ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کہانی و قصہ جتنا بھی اچھا ہوتا ہے ناول اتنا ہی پختہ ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں جوکہانی بیان کی ہے وہ بالکل حقائق پر مبنی ہے۔ ماہرین سماجیات اور تہذیب کی کھوج لگانے والے ماہرین ہندوستان کے طول وعرض میں ماضی بعید میں کئی ایک ایسی بستیوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں، جو ماضی میں موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات کاشکار ہوکر صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ یوسف نون ''بہاؤ'' اور ہندوستان کی قدیم معدوم بستیوں کے درمیان اسی حقیقی تعلق کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''ناول کاموضوع وادی ہاکڑہ کی تباہ وبرباد ہوتی پانچ ہزار سالہ قدیم تہذیب ہے جو تباہی دریائے گھاگھرہ یا ہاکڑہ کے خشک ہونے کے سبب وقوع پذیر ہوتی ہے۔''(۶)

ماضی میں ہندوستان کے طول وعرض میں جب بھی کسی دریانے اپنا راستہ بدلایا قدرتی تغیرات کی وجہ سےایک خاص دریاکے سوتے خشک ہوئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دریا کے قرب و جوار کی انسانی آبادیوں اور دیگر حیات تباہی و بربادی کاشکار ہوگئی ۔ماضی بعید میں زمین پر سفر کرنا اور پانی و خوراک کے متبادل ذرائع تلاش کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اس دور میں سفر خطرات سے پُر ہوتے اور کسی دوسری انسانی آبادی تک کے نشانات کی تلاش ایک طرف تو ناممکن ہوتی اور دوسری طرف خطرات سے پُر بھی۔ یہ خطرات مستقل طورپر سفرکرنے والوں کے سر منڈلاتے رہتے تھے۔مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں اس امر کی نشاہدہی بھی کی ہے۔ وادی ہاکڑہ کی تباہ وبرباد ہوتی پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اسی تہذیب کو موضوع بنایا ہے۔ دریائے گھاگھرہ کے خشک ہونے کے سبب اس تہذیب کے اجڑنے اور بسنے کی ایک طویل تاریخ ہے ۔یہ ناول اسی تباہی و بربادی کانوحہ ہے جو ہڑپہ (پنجاب) جسے پرانے نام ہری یوپیا سے مستنصر حسین تارڑ نے موسوم کیا ہے اور اس کے علاوہ ''موہنجوڈارو'' سندھ کے معاصر اور درمیانی فاصلے پر واقع قدیم تہذیب سے موسوم کیا ہے۔ یہ دونوں تہذیبیں دراصل جڑواں تہذیبیں تھیں اور ان دونوں تہذیبوں کے دریافت شدہ آثارمیں کئی ایک مشترک خصوصیات ملتی ہیں جو دونوں تہذیبوں کے باسیوں کے باہمی روابط اور تعلقات کا پتہ دیتی ہیں۔اس طرح یہ ناول قدیم تہذیب کی بازیافت بھی ہے اور عکاسی بھی۔ اس لیے یوسف نون کانقطہ نظر اہمیت اختیار کرجاتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ؛

''وادی ہاکڑہ تاریخ میں ایک ایسا خطہ ہے جس کی انسانی آبادیوں کی تاریخ شاندار بھی ہے حیرت افزا بھی اور عبرت انگیز بھی۔ یہ خطہ زمانہ ماقبل از تاریخ اور پتھر کے زمانے سے لے کر موجودہ سائنسی دورتک اپنے بسنےاور اجڑنے کی کئی داستانیں اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔''(۷)

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس قدیم تہذیب اور اس تاریخی دریا کی باقیات آج بھی صاف طورپر خطہ بہاولپور میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس دریا کا زمینی راستہ آج

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

بھی واضح طورپر دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں کبھی یہ پوری آب وتاب سے بہتا تھا۔ یوسف نون کہتے ہیں؛

''بہاؤ کو وادی ہاکڑہ کی ایک بستی کے آباد ہونے سے اجڑنے کی داستان قرار دیا جاتا ہے۔''(۸)

اس وادی کا حدود اربع بیان کرتے ہوئے یوسف نون لکھتے ہیں۔

''وادی ہاکڑہ موجودہ بہاولپور ڈویژن پر مشتمل ہے۔ دلر سے ریتی تک خشک شدہ دریائے ہاکڑہ کی وادی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف تین سو میل لمبی ہے اور اس کی چوڑائی پچاس میل ہے۔''(۹)

اس خطہ میں دریائے سندھ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور باقی دریاؤں کو دریائے سندھ کے معاون دریا قرار دیا جاتا ہے کیونکہ باقی دریا آخر دریائے سندھ میں جاکر شامل ہوتے تھے جو دریااب اس خطہ میں باقی ہیں اب بھی ان سب کا اختتام دریائے سندھ میں ہوتا ہے یوسف نون کے مطابق؛

''دریائے سندھ کایہ عظیم معاون دریا جو اپنے منبع سے پٹیالہ تک دریائے سرسوتی بیکانیر تک دریائے گھاگھرا اور فورٹ عباس سے صادق آباد تک دریائے ہاکڑہ کے نام سے موسوم ہے۔'' (۱۰)

اس دریا کی اپنی ایک تاریخ اور تہذیب تھی۔ جب یہ دریا بہتا تھا تو اس کے کنارے سینکڑوں بھرے پرے شہر اور سر سبز و شاداب انسانی بستیاں تھیں۔ صنعتی وتجارتی مراکز تھے اور دفاعی قلعے تھے، اور دریائی بندرگاہیں تھیں ۔ ان کا ایک اعلیٰ تمدن تھا اور بودوباش تھی اور پھر ایسا ہواکہ جغرافیائی تبدیلیوں کے سبب یہ دریا خشک ہو گیا۔ آبادیوں او ربستیاں ویران ہوگئیں۔ اس تباہی کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں ۔اس دریا کے برباد ہونے سے پورا ایک تمدن بربادہوگیا۔

صدیق طاہر کے الفاظ میں:

''دریا کیا روپوش ہوا ایک پورا تمدن روپوش اور انسانی بستیوں پر صحرائے چولستان کی زردیت نے اپنے پنجے گاڑ دئیے۔''(۱۱)

ناول''بہاؤ'' کو اس تہذیبی فضا اور ارتقاء کا نوحہ قرار دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔اس کی بربادی سے کرۂ حیات، ماحولیات اور فطرت کی موت واقع ہوئی۔ ناول میں اس تباہی کی کہانی اتنی المناک اور دردناک ہے کہ ناول کے مطالعے سے قاری پر ایک جذباتی المناکی طاری ہوجاتی ہے جو اتنی تکلیف دہ ہے کہ اس کی کیفیات بہت دیر تک دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں ، اور تب ناول کا عنوان مرکزی حیثیت اختیار کرجاتا ہے اور پانی کی انسانی بقاء کی جدوجہد میں کلیدی حیثیت مزید واضح ہوجاتی ہے اس سلسلے میں یوسف نون کے الفاظ بڑے معنی خیز ثابت ہوتے ہیں ،الفاظ ملاحظہ فرمائیں؛

''پانی زندگی ہے جب پانی سوکھ جاتے ہیں تو صرف تہذیب ہی نہیں مرتی بلکہ ان دریاؤں سے منسلک تمام کرۂ حیات کو شکست و ریخت کا سامنا کرناپڑتا ہے۔ انسان تو پھر بھی کسی نہ کسی طور اپنی بقاکی جنگ جیتنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پر دیگر حیاتیات اور نباتا ت معدوم ہوکررہ جاتے ہیں۔''(۱۲)

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

یوسف نون کے یہ الفاظ محض الفاظ نہیں بلکہ وہی نقطہ نظر ہے جو اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے اختیار کرتے ہوئے اس دریا کے سوکھنے کے اثرات کی کئی ایک جھلکیاں پیش کرکے اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

''ایک گھبراہٹ اور بے چینی تھی جو دھیر ے دھیرے ان سب میں تیرنے لگی تھی یہ گھبراہٹ ان کے جسموں میں مرتے پکھیرو کی طرح پھڑپھڑاتی تھی اور وہ جان نہ پاتے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔''(۱۳)

اس بستی کے لوگ اندر ہی اندر اس تباہی وبربادی کے اندازے کرچکے تھے ۔ جو پانی کے نہ آنے کی صورت میں ان کو جھیلنی پڑنی تھی لیکن وہ خود کودلاسہ دیتے اور ابھی بھی خالی خالی سی امیدیں باندھے ہوئے تھے کہ پانی آجائے گا ، کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں اس دریا کے مستقل طورپر خشک ہونے کی کوئی مثال نہیں سنی تھی ،لیکن ان کو یہ بھی محسوس ہونے لگاتھا کہ اب یہ انہونی ہوکر رہے گی۔

ان کی اندرونی کیفیات کا ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیں؛

''تم دیکھتے تھے کہ کنویں کاپانی بھی نیچے ہوگیا ہے اور تم دیکھتے تھے کہ کتنا نیچے ہوا ہے اور ایسا ہوناتھا ۔ ایسا بہت کچھ ابھی ہونا ہے پر تم میرے جُسے پرپانی ڈالتے رہو ،اتنا تو اس کنویں میں کہ مجھے ٹھنڈا کرسکے۔''(۱۴)

پاروشنی کے گھر میں پینے کے پانی کاکنواں تھا جوکہ طویل عرصہ سے گاؤں والوں کی پینے کی پانی کی ضرورت پورا کررہا تھا، اور اب وہ خشک ہوتے ہوئے بالکل سوکھنے کے قریب تھا، اور پاروشنی اس میں سے پانی نکال کر گاؤں والوں کو فراہم نہیں کرسکتی تھی بلکہ اب اس سے اپنا جسم گیلا کرنے کے لیے بھی پانی نکالنا مشکل ہورہا تھا چنانچہ اس نے اس ورچن سے پانی نکال کر اپنے جسم پر ڈالنے کے لیے کہا ،ورچن کو احساس ہوا کہ بوکا کنویں میں گرایا جاتا ہے تو پانی تک پہنچنے کے بعد جو مخصوص آواز پیدا ہوتی ہے اب وہ آواز پیدا نہیں ہوتی ہے۔

پاروشنی اور ورچن کے درمیان ہونے والے مکالمے اور بستی کے باسیوں کے چہروں پر طاری سوگوار فضا اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ جان چکے تھے کہ ان کی زندگی ،تہذیب وتمدن اور ثقافت سب کچھ تباہی کے دہانے پر ہے ،اور بالآخر ایسا ہی ہوا ۔ مجموعی طور پر اس ناول کی کہانی اور قصہ دلچسپ بھی ہے اور دردناک بھی۔

''بہاؤ'' مستنصر حسین تارڑ کی پلاٹ نگاری پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہےکہ کچھ سرسری نظر پلاٹ کی تعریف پرڈالنی چاہیے۔عظیم الشان صدیقی کے مطابق ؛

''پلاٹ کی بھی متعدد قسمیں ہوتی ہیں ،لیکن عام طورپر دوطرح کے پلاٹ زیادہ ترتیب دئیے جاتے ہیں ۔(i) ڈھیلا پلاٹ (ii)گٹھا ہوا پلاٹ ۔'' (۱۵)

دراصل پلاٹ واقعات کی منطقی توضیح وترتیب کا نام ہے۔ عام طورپر سب سے اچھا پلاٹ وہی تصور ہوتا ہے جو اپنے موضوع اور مواد سے ہم آہنگ ہو اور

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

فن کا راز بصیرت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو ، ساتھ ہی اس کی تعمیر میں اتحاد وتوازن ،تاثیر ، حسن اور بیت کا خیال رکھا گیا ہو۔ یعنی پلاٹ کہانی کی ترتیب کا نام ہے۔ یہ کہانی کو علت و نتیجہ کے ساتھ بیان کرکے خوبصورت بناتا ہے ۔ قاری کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے۔ پلاٹ کے لغوی معنی جوڑنے کے ہیں۔ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کے ساتھ مربوط کرکے خوبصورت بنانا قاری کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے۔ پلاٹ کے لغوی معنی بھی جوڑنا کے ہیں ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کے ساتھ منطقی طورپر ربط پیدا کرنے کو پلاٹ کہتے ہیں۔ اس طرح ناول نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اس منطقی ترتیب میں ڈھلی کہانی کے ذریعے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ قصہ میں اس کا جواب دینے کے لیے پلاٹ عمل میں آتا ہے۔ قصہ کا تیسرا جزذریعہ ہے جو کردار کہلاتا ہے۔ قصہ کے یہ تینوں جز ناول نگار کی توجہ کے مرکز ہوتے ہیں۔ پلاٹ کا تسلسل ہی ناول میں جان ڈالتا ہے ،لیکن پلاٹ کا تسلسل ٹوٹ جائے تو کہانی کا موضوع پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ ایک اچھا ناول نگار پلاٹ کی بنت میں متذکرہ بالا خوبیوں کا خاص خیال رکھتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی قصہ پن اور پلاٹ نگاری ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں خصوصاً ناول بہاؤ کی تخلیق کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ انکشاف کرتے ہیں کہ؛

''میں چولستان گیا ،وہاں مجھے وہ ٹھیکریاں سی ملیں جنہیں میں نے بعد میں ناول میں استعمال کیا۔ پھرمزید تحقیق کی ناول کی شکل سامنے آئی تو جیسا میں کہا میں اپنے کام پر بہت محنت کرتا ہوں۔''(۱۶)

مستنصر حسین تارڑ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ گھر بیٹھے بٹھائے کہانیا ں نہیں بنتے بلکہ اپنی کہانیوں کے لیے قصہ تلاش کرتے ہیں۔ حقیقی زندگی سے واقعات اکٹھے کرتے ہیں اور پھرکہانی کاپلاٹ ترتیب دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کو موضوع اور پلاٹ کو ہم آہنگ کرنے کے فن پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ ناول ''بہاؤ ''کا آغاز ہی قاری کو کہانی کے سحر میں مبتلا کردیتا ہے جو آخر تک قائم رہتا ہے۔

ناول ''بہاؤ'' کا آغاز دردناک منظر کشی سے ہوتا ہے جب ایک پرندہ اپنے ڈار سے بچھڑ جاتا ہے اور پانی ،خوراک اور اپنے غول کی تلاش میں مارا مارا اُڑتا ہے۔ آخر وہ ایک بستی کے آثار دیکھتا ہے جہاں پانی کے آثار بھی نظر آتے ہیں ۔ وہ کئی دنوں سے بھوکا اور پیاسا تھا اور اپنی تھوک نگل کراپنے حلق کو ترکرنے کی مشق کرتاکرتا اب اس قدر پیاس سے نڈھال ہوچکا تھا کہ وہ تھوک نگلنے میں بھی تکلیف محسوس کرتا تھا کیونکہ گلا بالکل خشک ہوچکاتھا ۔ جب وہ بلندی سے کافی نیچے آیا تو اس نے دیکھا کہ اسے جو پرندے نظر آرہے تھے وہ سب کے سب خشک ریت پر بھوک اور پیاس سے نڈھا ل گررہے تھے۔وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی اڑان کی سمت اس نمی کی جانب برقرار نہ رکھ سکا اور وہاں سے کافی دور اڑتا چلا گیا ۔ لیکن پھر نڈھال ہوکرپرندوں کے درمیان آگرا اس پہلے منظر کی جھلک کا اختتام اس ناول کی مرکزی نسوانی کردار پاروشنی کے اس پرندے کو اٹھا کر اس کی کھلی

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

چونچ میں پانی ٹپکانے کے منظر پر ہوتا ہے۔

پلاٹ کو بنتے ہوئے جوسب سے زیادہ خوبصورتی نظرآتی ہے وہ مستنصر حسین تارڑ کی اختصار کے ساتھ جامعیت اور جدت کے ساتھ واقعات کی پیشکش ہے۔ ناول کا یہ پہلا منظر مکمل بامعنی اور بامقصد محسوس ہوتا ہے جو صرف چند صفحات کے اندر اختتام پذیر بھی ہوجاتا ہے۔ ایک واقعہ اور حصہ کو ناول کے دوسرے واقعہ اور حصہ سے جوڑنے کی خوبصورت تکنیک کا اندازہ ناول کے دوسرے حصہ اور واقعہ کے آغاز سے صاف محسوس کیا جاسکتا ہے ۔

دوسرے حصہ کے ابتدائی جملے ملاحظہ فرمائیں؛

’’می آؤں می آوں‘‘رُکھوں کے اندر سے کہیں موربولا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لٹکی پروں کی پوٹلی کو ان بے شمار پرندوں کے اوپر رکھ دیا جو اب ہڈیاں ہوچکے تھے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔‘‘(۱۷)

پہلے حصہ کے اختتام پر پاروشنی کا تعارف کروایا گیا اور اس سے تھوڑا قبل کے جملوں میں بھوک اور پیاس سے نڈھال پرندوں کے پانی کے آثار پر نیچے اتر کر مرتے دیکھایا گیا۔ پاروشنی پرندوں سے مانوس ہے اور وہ گرنے والے پرندوں کی کھلی چونچ میں پانی کے قطرے ڈالتی ہے۔

اس منظر کے فوراً بعد مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول کے مرکزی موضوع کی تقویت کے لیے دریا میں گزشتہ برسوں کے دوران پانی کی مسلسل قلت وکمی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے قاری کو گزشتہ معلومات یوں فراہم کیں ہیں؛

’’گئے برسوں میں پانی یہاں تک آتا تھا ۔ اس نے قدموں میں بچھی سفید مٹی کی تہہ کو دیکھا۔ رُکھوں کے ذخیرے میں چھپا ہوا یہ کلر اٹھا میدان پانچ چھے سو کرولمبائی میں اور چوڑائی میں ہوگا۔ پہلے تو جھیل کے پانی رُکھوں کے تنوں تک آتے تھے پر اب وہ صرف بیچ میں سو ڈیڑھ سو کرو کے رقبے میں سمٹ گئے تھے۔ گہرائی میں بھی بس اتنے کہ تہہ کا کیچڑصاف نظر آتا تھا اور چوپائے اس میں کھڑے رہ سکتے تھے۔‘‘(۱۸)

مستنصر حسین تارڑیہاں پر ایک حساس ترین اور معاملہ فہم تخلیق کار کی اعلیٰ خوبیوں کے حامل تخلیق کار بن کر سامنے آتے ہیں جن کو شدید احساس ہے کہ ناول کی تخلیق کا مقصد کتنا اہم ہے اور قاری کو اس مقصد کا احساس دلانے کے لیے بنیادی جزئیات کی جامعہ پیشکش کتنی ضروری ہے۔ ایک اور اہم بات اس پورے ناول کی پیشکش میں انسانوں ، جانوروں، پرندوں ،درندوں اور نباتات کے درمیان باہمی تعلقات کی پیشکش ہے۔انسان کواپنے ابتدائی دور سے ہی اسی طرح کے ماحول میں زندگی کی جدوجہد کا آغاز کرنا پڑا۔ حیران کن طورپر تمام جانداروں کا اس کائنات کرۂ ارض میں بقا کے لیے ایک دوسرے پر انحصار لازم وملزوم رہا ہے، اور مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول کی پیشکش میں اس اہم نقطہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کرۂ ارض پر پائی جانے والی حیات میں مورایک خوبصورت اور نرم و نازک ترین پرندہ ہے اور انسا ن کو متجسس کرنے والے پرندوں میں سے ایک ہے، آغاز سے اختتام تک مور کی آواز اس ناول میں بہت سی اہم باتوں اور حقیقتوں کی طرف

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special

Online ISSN 3007-3197 | Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

اشاروں کاایک استعاراتی استعمال کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

''می آؤں می آؤں رُکھوں میں موربولا،اور پاروشنی کے اندر گھنے اندر جہاننیم تاریکی تھی وہاں بھی کچھ بولا ، می آؤں می آؤں۔ان دونوں پر پورا چاند پڑتا تھا اور وہ رُکھوں کے بیچ جھیل کے پاس اس کلر اٹھی زمین پر جہاں کبھی جھیل تھی لیٹے تھے اور وہ وہاں تھے جہاں پرندے مرنے کو آجاتے تھے۔ ان کےبدنوں تلے پرندوں کی ہڈیاں چُرمُر ہوتی تھیں۔''(۱۹)

اس اقتباس میں شادی کے بعد ملاپ کی پہلی رات پاروشنی اور سمر و ایک کھلے میدان میں جنسی عمل کرتے محسوس ہوتے ہیں۔پاروشنی خود اس عمل کے لیے اس میدان کاانتخاب کرتی ہے۔ مور کی آواز ایک مخصوص تاثر پیداکرتی ہے۔اسی طرح پورے ناول میں مور کی آواز فضا میں کچھ خاص تاثرات پیداکرتی رہتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی ایک خوبی جو اس ناول میں سامنے آتی ہے۔مختلف واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور حصوں کو مختصر لیکن جامعہ انداز میں پیش کرنا اس کے علاوہ جو پلاٹ کی بنت میں دوسری اہم خوبی سامنے آتی ہے وہ ہے کرداروں کاتعارف کروانے کا انداز نہایت عمدہ ہے۔وہ کرداروں کو متعارف کرواتے جاتے اور ان کے باہمی تعلقات خدوخال ،فکر اور سرگرمیوں سے متعلق قاری کو ضروری معلومات بھی فراہم کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ کہانی کے تمام کرداروں کو متعارف کرواتے اور کہانی کو عروج تک لے جاتے ہیں،اور آخری حصہ میں ان واقعات کے حتمی نتائج یاانجام کی طرف بتدریج متوجہ ہوتے ہیں اور غیر محسوس انداز میں ایک منظم طریقے سے کہانی کو انجام تک لے جاتے ہیں۔ جیساکہ سب سے پہلے پاروشنی کو متعارف کروایا گیا۔ پھر اس بستی اور اس کے آس پاس کاماحول اور محل وقوع بیان کیا گیا۔ بستی کے پاس کچھ فاصلے پر گھنے جنگلات کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور گاؤں کے ساتھ ہی وہ زرخیز ریتلی زمین کے کھیت ہیں جہاں گاؤں والے مختلف اجناس کاشت کرتے ہیں جن سے جانوروں کے لیے چارہ اور انسانوں کے لیے خوراک حاصل ہوتی ہے۔ جوار،باجرہ، جو اور گندم وہ اجناس ہیں جن کے بیج ان کے پاس محفوظ رہتے ہیں اور وہ ہر سال بڑ ے پانیوں کی آمد سے پہلے زمین نرم کرکے ان کو کاشت کرتے ہیں۔

ایک کامیاب ناول نگار پلاٹ کی بنت میں صرف کرداروں اور واقعات کاسہارا ہی نہیں لیتا بلکہ وہ جزئیات نگاری اور منظر نگاری کی مددسے ماحول اور فضا کی بھرپور عکاسی کی کوشش بھی کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی اس فن کا نہایت مستعدی سے مظاہرہ کیا ہے۔ دریا ،پرندوں، جانوروں، جنگلات، کھیتوں کھلیانوں اور بستی کے اندر اور باہر کے ماحول کا انہوں نے اتنا بھرپور نقشہ کھینچا ہے کہ قاری کے تخئیل پر اس پرانی تہذیب کے آثار کے نقشے خود بخود ابھرنے لگتے ہیں اور وہ ماضی کے دریچوں کو کھولنے کی غیر شعوری کوشش میں

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

مصروف ہوجاتا ہے۔مثال کے طور پر کاشتکاری کی عکاسی کاانداز ملاحظہ فرمائیں؛

’’سارے باسی اسے کھودنے کے لیے اپنااپنا حصہ بانٹ لیتے اور پھر اس میں کنک ، جو اور مٹری وغیرہ کے بیج ڈال کر اسے پدھر کردیتے ......جب پھوٹ پڑتی ، بوٹے بنتے اور ان میں بیج پڑتا تو وہ سب کا سانجھا ہوتا۔‘‘(۲۰)

قدیم تہذیب کاانسان زندگی کی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے وسائل کی کمیابی کی وجہ سے ایک دوسرے پر مکمل انحصار بھی کرتا تھا اور بھروسہ بھی۔ یہ انسان کی قدیم تہذیب کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ مستنصر حسین تارڑ نے واقعات کی پیشکش کے دوران ماضی کی قدیم تہذیب کی کئی ایک خصوصیات کوبڑے مؤثر اندا ز میں نمایاں کیا ہے۔

قصہ وکہانی میں کردار نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اچھا اور کامیاب کردار ناول کی کامیابی کی ضمانت ہوسکتا ہے۔ کسی کہانی میں کردار کی اتنی اہمیت ہوتی ہے کہ کردار کے اردگرد ہی ناول گھومتا ہے ،اور کوئی کردار اس طرح سے ڈھیلا ہوتا ہے کہ کہانی اسے دھکا لگاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ کردار اتنے اہمیت اختیار کرجاتے ہیں کہ کہانی کو انہی کرداروں سے پہچانا جاتا ہے۔ مثال کے طورپر ناول امراؤ جان ادا، اختری بیگم ،لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈائری، نرملا سیتا ہرن، شیخ چلی، وغیرہ کرداری ناول ہیں۔ ناول میں کئی طرح کے کردار ہوتے ہیں لیکن عمل کے اعتبار سے ان کرداروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ (i)سپاٹ کردار اور (ii) مدور کردار۔ سادا یاسپاٹ کردار صرف زندگی کا ایک ہی رُخ پیش کرتے ہیں ۔سپاٹ کردار کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں ۔جواپنی مقبولیت قائم رکھتے ہیں۔مدور قسم کے کردار سادہ کردار سے کہیں زیادہ پختہ ہوتے ہیں وہ وقت اور حالات کے طورپر بدلتے رہتے ہیں۔ جب سادہ کردار میں زیادہ خوبیاں آجاتی ہیں تووہ مدور کردار بن جاتے ہیں ۔ عظیم الشان صدیقی کے الفاظ میں؛

’’ایک اچھے ناول میں دونوں قسم کے کردار ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اچھا کردار وہی کہلاتا ہے جس میں زندگی کی حرارت موجود ہوقوت ِعمل اور زندگی کو بہتر بنانے کاجذبہ موجود ہو ایسے کرداروں کو اگر اجتہادی کردار کہاجائے تو بے جانہ ہوگا۔‘‘ (۲۱)

یہ تعریف کردار کی شان میں پورا اترتی ہے۔ تعریف کے مطابق ماضی کے ناولوں میں امراؤ جان ادانام خاصا اہم ہوتا ہے ۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول ’’بہاؤ‘‘ اگر ایک کرداری ناول قرار دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔’’بہاؤ‘‘ میں کئی ایک کردار ایسے ہیں جواپنے مقام اور پیشکش کی ضرورت کے لحاظ سے پرفیکٹ کردار ہیں۔پاروشنی اس ناول کامرکزی کردار ہے ،عموماً دیکھا گیا ہے کہ کردار نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے مردانہ کرداروں اور پھر نسوانی کرداروں کو زیر بحث لایا جاتا ہے، لیکن اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ کے بعض نسوانی کردار اتنے جاندار ہیں کہ انہیں مردانہ کرداروں پر برتری حاصل ہے۔ پاروشنی بھی ایسا ہی ایک کردار ہے جو زندگی سے بھرپور کردار ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی نمائندہ ہے اور اسے

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

اپنے سماج سے بے حد لگاؤ ہے۔ وہ گاؤں یا بستی کی سب سے خوبصورت نوجوان لڑکی ہے۔وہ اپنے ہم عمر سمرو اور ورچن دونوں سے پیارکرتی ہے،اور دونوں سے جنسی تعلقات بھی استوار کرتی ہے ۔یہ تعلقات اس نے جوانی کی عمر کو پہنچتے ہی استوار کرلیے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کون ان دونوں میں سے اس سے زیادہ پیارکرتا ہے لیکن وہ یہ جاننے میں کامیاب نہ ہوسکی ،البتہ دونوں کی بھرپور چاہت سے ثمریاب ہوتی رہی۔ آخر ورچن نے اسے شادی کی پیشکش کی جو اس نے قبول کرلی۔ ورچن سہاگ رات سے محسوس کرگیا کہ پاروشنی کی محبت صرف اس ایک اکیلے مرد کے لیے نہیں بلکہ کوئی اور بھی ہے جسے وہ بہت چاہتی ہے چنانچہ وہ دونوں کے درمیان سہاگ رات کے بعد سے مثالی تعلقات قائم نہ رہ سکے۔ چونکہ پاروشنی دونوں سے جنسی تعلقات قائم رکھے ہوئے تھی لہٰذا حاملہ ہونے کے بعد اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آنے والا بچہ سمر و کا ہے یا ورچن کا ،چنانچہ اس نے اس کے مہاندرے سے اس امر کا نتیجہ نکالنے کا فیصلہ کیا،اور جب بچے کی پیدائش کاوقت نزدیک آیا تو دریا پار کرکے جنگلوں میں چلی گئی کہ وہ جان سکے کہ اس کا مہاندرہ کس پر ہے۔ لیکن یہ بچہ پیدا ہواتو حرکت نہیں کرتا اور نہ اس کی سانس چلتی تھی۔چنانچہ وہ اسے دفن کرکے واپس بستی میں آگئی اور جوکوئی بھی اس سے بچے کے بارے دریافت کرتا وہ چپ رہتی ہے اور اس موضوع پر بات کرنے سے کترانے لگتی ہے۔ پاروشنی اپنے رسم ورواج ،سماجی روایات اور مذہبی عقائد سے جڑی ہوئی لڑکی ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک پیپل کادرخت بہت مقدس تھا ۔پاروشنی جب پیپل کے درخت کے قریب سے گزر تی ہے تو سرجھکا کر تنوں کے نیچے سے گزر جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنی عقید ت اور احترام کا اظہار کرتی ہے ۔جنگل میں ایک درختوں کا جھنڈ ان عورتوں کے دھاگہ باندھنے اور منت مانگنے کے لیے مخصوص تھا جو بانجھ پن کا شکار ہوتی تھیں۔پاروشنی بھی وہاں جاتی ہے اور دھاگہ باندھتی ہے۔پاروشنی کودریا کے آس پاس اور جھیل کے خشک اور ڈبو مٹی والے راستوں کامکمل ادراک ہے وہ جنگل کے اندر بھی تمام راستوں سے واقف تھی۔ جب اس کاجنسی ہیجان بڑھتا ہے تووہ جنسی بھوک مٹانے کے لیے سمرو یا ورچن کو ڈھونڈتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

’’پاروشنی بھی بڑی میا اور کھیتوں کے لیے سب کچھ کرسکتی تھی لیکن اس کا جی چاہتاتھا صرف ورچن ؟یاسمرو ہو؟ورچن یا سمر و کون؟ اس کے بیچ بدن میں پھر ایک تھرتھراہٹ ہوئی اور وہ گھبراکرتیز چلنے لگی۔‘‘ (۲۱)

اس گاؤں کے ہر فرد کے ذمے کوئی نہ کوئی کام تھا پاروشنی کے گھرمیں ایک کنواں تھا ۔وہ اس کنویں سے پانی بھر کے بستی کے سارے گھروں تک روزانہ صبح سویرے پہنچاتی ہے۔ بس یہی اس کی سماجی ذمہ داری تھی لیکن وہ اس کے علاوہ مانا کے بیلوں کی خدمت پر مامور دھروا کاہاتھ بھی بٹاتی تھی اور کبھی کبھی کھیتوں میں جاکر کام بھی کرتی ۔ اس بستی کی عورتیں اپنا نچلا دھڑ توجزوی طور پر ڈھانپتی ہیں لیکن اوپر والا دھڑ عموماً ننگا رکھتی ہیں لیکن پاروشنی اپنا اوپر والا دھڑ بھی ڈھانپ کر رکھتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

''پانی کو پیاس سے دیکھتے اس نے آسے پاسے دیکھے بغیر اپنے سینے پر کسا ہوا لیڑا ڈھیلا کر کے کھول دیا ۔ لیڑے کی پکڑ سے چھوٹنے پر اس کی چھاتیاں پل دوپل کے لیے تھرتھرائیں جیسے چنکارے ہرن کے پیٹھ پر زہریلی مکھی بیٹھ جائے تو وہ ہلتی ہے ۔ تھرتھرائیں اور پھراپنے بوجھ کو سہارکر پنڈے کا ایک خاموش حصہ بن گئیں ۔دریا کی باس کو ان کی اٹھان نے ایک ناک کی طرح سونگھا اور اپنے اندر رچایا۔''(۲۲)

دراصل اس تہذیب میں عورت کو بہت زیادہ عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور اس کے وجود کا ایک ایک حصہ نہایت اہم سمجھا جاتا۔ اس زمانے میں عورت کوایک سے زیادہ مردوں سے جنسی تعلقات قائم رکھنے کی اجازت تھی،اور بچے پیدا کرنے کے لیے وہ کسی بھی وقت کسی بھی مردسے تعلقات استوار کرسکتی تھی۔ چنانچہ پاروشنی بھی بیک وقت دومردوں سے تعلقات رکھتی ہے وہ دونوں سمرو اور ورچن یہ بات جانتے ہیں لیکن نہ تو ان دونوں کے تعلقات خراب ہوتے ہیناور نہ ہی وہ پاروشنی کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔پاروشنی بڑے پانی نہ آنے پر اداس ہوتی ہے ۔ پھرایک وقت آتا ہے کہ لوگ گاؤں چھوڑکر کسی دوسری آباد بستی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں ۔لیکن پاروشنی ایسا نہیں کرتی بلکہ سمرو کے ساتھ موت کا انتظار کرتی ہے اور گاؤں چھوڑکرنہیں جاتی۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے اس منفرد کردار کے حوالے سے بتاتے ہیں؛

''دراصل پاروشنی ایک ایسی لڑکی تھی جو بہت خوبصورت تھی میرے اور اس کے درمیان جذباتی رشتہ یا محبت کا رشتہ تھا۔ پاروشنی اسی کا سراپا ہےچال ڈھال جسمانی خطوط میں نے وہاں سے لیے ، مگر میں اسے پانچ ہزار سال پیچھے لے گیا۔''(۲۳)

پاروشنی کواپنے ماں باپ کے بارے میں زیادہ علم نہ تھا، جس عورت نے اس کی پرورش کی تھی اس کا نام ماتی تھا۔ اس کا شوہر فوت ہوا تو اس نے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق سات دن اور سات راتیں دریا سے باتیں کرتے گزاریں اور واپسی پر سروٹوں میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنی اور اسے اٹھا کر لے آئی او ر اس کی پرورش کی۔

اس ناول کا دوسرا اہم نسوانی کردار پکلی ہے۔ جس کا سب سے اہم کام برتن بنانا ہے۔ وہ مٹی کے برتن ، سیپیاں اور کھلونے بناتی ہے اور اپنے گھر میں لگے آوے پر ان کو پکاتی ہے ۔وہ فن مصوری کی مشاق ہےوہ مٹی کے برتنوں پر خوبصورت بیل بوٹے بناتی ہےمٹی کی بیل گاڑی ،عجیب مہاندروں والے بت، کچھ نئے مٹکےاور مہامیا جوکہ سب سے بڑا بت ہے، پکلی کے آوے پر بنتے اور بیل بوٹوں سے سجتے ہیں۔ جھجھر ،صحنک ، گھڑا، چاٹی، چھوٹی کنی، ڈولا، گڈوا، دوری ، جھانواں ، توے اور مرتبان یہ سب برتن مٹی سے بنائے جاتے اور آوے پر پکائے جاتے۔ جب دریا سوکھناشروع ہوتا ہے اور پانی بالکل کم ہوجاتا ہے اور بڑے پانی آنے کی امید دم توڑ جاتی ہے تو پکلی کو جتنے برتن بنانے آتے تھے وہ ان سب برتنوں کو بناکر پکاتی ہے اور دریا کنارے جاکر ان کو اوپر نیچے ایک ترتیب میں

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

رکھتی جاتی ہے،اور خیال کرتی ہے کہ کئی رتو ں بعدجب یہ بستیاں دوبارہ آباد ہوں گی تو وہ اس کا فن دیکھ کر اسے یادکریں گے۔ عورت ذات اپنے وجود اور اختیارات و کمالات کے حوالے سے ہمیشہ سے حساس تھی اس کا احساس ناول میں تب ہوتا ہے جب پاروشنی پکلی کو مشورہ دیتی ہے کہ گھرمیں بیکار پڑے رہنے والے اس کے شوہر گیرو سے بھی کام کاج کروانے کامشورہ دیتی ہے تو پکلی جواب دیتی ہے؛

’’مانا نے عورت ذات کو بہت زور دیا ہے۔زیادہ بوجھ دی ہے مہامیا بھی تو عورت ہے۔‘‘(۲۴)

پکلی کے ان الفاظ میں عورت ذات کی برتری اور زیادہ طاقتور ہونے کا وہی فلسفہ ہے جس کے تحت زمانہ قدیم سے عورت کو مرد پر برتری کاحامل سمجھا جاتا تھا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں پہلی وجہ یہ تھی کہ نسل بڑھانے میں عورت کا کردار مرد سے زیادہ اہم تھا۔ دوسراوہ جس ہستی کو صدیوں سے پوجتے آرہے تھے وہ بھی عورت تھی اور اسے وہ مہامیا کے نام سے پکارتے اور تعظیم کے لیے اس کی مورتی بناتے تھے۔ پکلی ہراس عورت کے جسم پر بیل بوٹے بناتی اور سجاوٹ کرتی تھی ،جس کی پہلی شادی ہوتی تھی۔ پکلی کے دوبچے تھے جن کے نام پندو اور سکرا تھے ، جو کھیلنے کے لیے بیل گاڑی بناکر ماں کے آوے پر رکھ دیتے تھے اور جب وہ پک کرتیار ہوجاتے تو پکلی ان کو ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیتی تھی۔ پکلی اس تہذیب کی ایک نمائندہ عورت ہے جو فکر مند ہے کہ اس تہذیب کے آثار کو محفوظ کیاجائے تاکہ آئندہ آنےوالے اس کے بارے میں جان سکیں۔

ماتی ناول ’’بہاؤ‘‘کا ایک اور اہم کردار ہے۔ اس نے ایک ہی رات چار بیٹے جنے تھے ان میں سے ایک پیدائش کے وقت مر گیا تھا اور باقی تین زندہ رہے۔ ماتی اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ گندم کی بوائی کے لیے کسی کی مدد سے زمین تیار کرتی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کو جھوریا کہہ پکارتی تھی۔ جب ماتی اور اس کے بیٹے زمین نرم کر کے گند م کابیج بو دیتے ہیں اور بڑے پانیوں اور بارش کا انتظار کرتے ہیں لیکن بڑے پانی اور بارش نہیں برستی تو وہ پریشان ہوجاتے ہیں ۔بڑے پانیوں کی آس امید آخر ٹوٹنے لگتی ہے اور جب گاؤں کے کئی لوگ بستی سے کوچ کرنے لگتے ہیں تو ماتی بھی ضروری سامان بیل ریڑھی پر لاد کر اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ کوچ کرجاتی ہے۔

گاگری اس ناول کا ایک اور اہم نسوانی کردار ہے۔اسے پرندوں کاشکار کرنے کی مہارت حاصل تھی اور وہی تھی جو بستی کے لوگوں کے لیے ایسا کرسکتی تھی۔ وہ پرندوں کا شکار کرکے اس کا گوشت گاؤں والوں کو کھلاتی تو وہ اس کے بدلے کنک کی ایک ایک ٹوپی دیتے ۔اس کے علاوہ وہ جنگل میں جاکر کبھی کبھی جو کچھ ملتا اس کا شکار کرکے لے آتی تھی۔ اس کی ایک بہن کواسی اور ایک بھائی گٹا تھے ، جن کے پاس ایک کھیت تھا جس میں گندم کا بیج بو کر وہ پانیوں کی آمد کاانتظار کرتے تھے ۔اس کی والدہ بوڑھی ہوچکی تھی اور کھیتوں میں کام کرنے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس کے بڑوں نے اسے سمجھایا تھاکہ اڑنے والے پرندوں میں اتنا زور ہوتا ہے کہ وہ پرانی اور جھڑتی ہڈیوں کو بھی جوڑدیتے ہیں۔وہ اپنے پرندوں کو

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

شکارکرنے کے فن میں اس قدر ماہر تھی کہ کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتی۔ اس عورت زاد تہذیب میں مرد کی حیثیت بس ایک سانڈ کی سی تھی جس کا کام بس عورت کے اندر اپنا بیج ڈال کر نسل بڑھانے کے کام آنا تھا۔ کواسی اس کی بڑی بہن تھی جو آلکس کی ماری تھی اور کچھ کام نہ کرتی سوائے پیٹ بھرنے یا پیٹ خالی کرنے کے۔ اس کاچھوٹا بھائی گٹا اس کا جُسہ دباتے دباتے تنگ آجاتاتھا۔مستنصر حسین تارڑ نے مدرسری نظام کی ایک جھلک دکھانے کے لیے کواسی کی زندگی کو مثال بناکر جوباتیں روایت کی ہیں ان میں سے ایک روایت یا اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

’’کواسی ایک دوبار بیاہی گئی ،پر زیادہ نباہ نہ کرسکی۔ اور مرد کو گھرسے باہر کر دیا۔ ادھر یہی ہوتاتھا مرد تو بیج ڈالنے والا تھا۔ اب یہ عورت کی مرضی تھی کہ اس کے ساتھ لیٹے یا نہ لیٹے،اسے کھانے کو دے یا نہ دے۔‘‘(۲۵)

اسی اقتباس میں مستنصر حسین تارڑ نے جوبات روایت کی ہے اس کو عام لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس تہذیب میں عورت نہیں بلکہ مردبیاہ کرعورت کے گھر جابستے تھے۔ اور اسے اگرمرد کا جھگڑا ہوجاتا تو وہ مرد کو گھر سے نکال دیتی تھی اور ایک وقت میں دودو شوہر بھی رکھ سکتی تھی۔ گاگری کی شادی چیوا سے ہوئی اس کی کوکھ ہری ہوئی بچہ پیدا ہوا لیکن مردہ تھا۔ بچے کی موت کے بعد گاگری دوبارہ پرندوں کا شکار نہ کرسکی اس کے دل میں رحم پیدا ہوگیا تھا جو اسے شکار کرنے سے روکتا تھا۔

اس ناول کے مردانہ کردار بھی اتنے ہی اہم ہیں کہ جتنے نسوانی کردار۔ان میں سے سمرو،ڈروگا، چیوا، ورچن ، دھروا، من ماساسب سے زیادہ اہم کردار ہیں۔ سمرو اس ناول کا ایک نمائندہ کردار ہے اس کا جنسی تعلق پاروشنی سے قائم ہے وہ ورچن کا دوست ہے اور دونوں پاروشنی سے برابر محبت کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کے لیے یہ فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کون زیادہ پیار کرتا ہے۔

سمرو ایک کاری گر ہے جو خواتین کے زیور بنانا جانتا ہے وہ یہ زیور مختلف دھاتوں کی مدد سے بناتا ہے،اور اس کے علاوہ کھیتی باڑی کے اوزار بھی بنالیتا ہے۔ اس بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کے اس فن کی روایت کو آگے بڑھائے چنانچہ سمرو اپنے اس فن کے مستقبل کے بارے میں فکر مند نظر آتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کی موت کے بعد کون اس فن کو زندہ رکھے گا؟ کون یہ چیزیں بنائے گا؟ ساتھ وہ اپنے ماضی کو یاد کرکے فکر مند ہوتا ہے وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا یہ فن کب اور کیسے شروع ہوا،اور اس تک پہنچا۔ سمرو کی فکریہ ثابت کرتی ہے کہ انسان ہمیشہ سے اپنے سے پہلے والوں کی زندگی کے بارے میں متجسس رہا ہے۔ لیکن ماضی بعید میں انسانی بستیاں باربار برباد اور آبادہوتی رہیں لیکن اس تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیے یاتوکوئی لکھی ہوئی تحریر محفوظ نہ تھی یا اگر بعض مقامات سے آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے کچھ تحریریں دریافت بھی کی ہیں تو ان کی زبان سمجھنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

ورچن مردانہ کرداروں میں سب سے منفرد ایک کردار ہے۔ جو ایک سیاح ہے جو بستی کے باقی لوگوں سے ذرا الگ سوچتا ہے۔ اور و ہ اپنی بستی سے نکل کر

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

باقی کی دنیا میں انسانی آبادیوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے ۔وہ دریاؤں،صحراؤں، جنگلوں اور ندیوں کے دشور گزار رستوں سے گزر کر پیدل سفر کرتا ہے۔اسے موسموں ،ر استوں اور زمینوں کی پہچان ہے۔ بھوک پیاس برداشت کرتا ہے حتیٰ کہ سفر کے دوران قدرتی آفات اور صحرائی و جنگلی جانوروں کا بھی مقابلہ کرتا ہے۔ ورچن پھرتا پھراتا موہنجوڈارو جاپہنچتا ہے او روہاں اس کی ملاقات پورن سے ہوتی ہے،موہنجو کے لوگوں کے قریب جانا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو دیکھتے ہی جان سے ماردیتے تھے۔

ورچن ،سمروکوموہنجوآنے کے اسباب بتاتے ہوئے کہتا ہےکہ؛

’’کبھی کبھار ڈیرہ ڈالنے والے لوگ ادھر کو آتے تھے اور ہم سے لین دین کرتے تھے، پر اب یہ لوگ بڑھتے جاتے تھے اور پھر ایسے بھی تھے جن کا کوئی گھربار نہ تھا اور ان کے پاس اُن پانی کے لیے بھی کچھ نہ تھا اور ان میں سے وہ ہمیں بتاتے تھے کہ وہ بھی ہماری طرح ہی بستیوں میں تھے پھراسوا پر بیٹھے ہوئے اونچی ناکوں والے آئے انہیں وہاں سے باہر کردیا ۔سنو پورن اور وہ بستیوں کو چھوڑ کر بکھرگئے اور اب اس زمین پر مارے مارے پھرتے ہیں....پتہ ہے پورن کہ تم نے ان سب کے اندر ایسا ڈر بھر دیا ہے کہ وہ تمہیں انسان نہیں کچھ اور سمجھتے ہیں۔‘‘(۲۶)

ان بستیوں کے رہنے والے بالکل سادہ لوگ تھے جنہوں نے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس کھانے پینے کو وافر تھا۔ لہٰذا ان کو کبھی سفر کی ضرورت نہ پڑی پھر شمال مغربی دروں سے پہاڑوں سے اترکرایسے لوگ آئے جنہوں نے اپنے لوہے، لکڑی اور کانسی کے خطرناک ہتھیاروں سے حملہ کرکے ان لوگوں کو بستیوں سے بے دخل کردیااور ان بستیوں پر قابض ہوگئے۔ بے دخل ہونے والے مارےمارے پھرتے اور آبادیوں میں جاکر اپنی بربادی کاحال سناتے تھے۔

ورچن ان لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا لہٰذاوہ ان کو تلاش کرتے کرتے موہنجوڈارو میں ان کی آبادیوں تک پہنچا اور ہری یوپیا یعنی ہڑپہ کی آبادیوں کو بھی دیکھ چکا تھا لہٰذا اس نے مشاہدہ کیا کہ وہ لوگ پکے مکانات بناتے اور چار سموں والے جانوروں کی سواری کرتے تھے ان کے پاس زیادہ مؤثر ذرائع آبپاشی اور پختہ گھرتھے لیکن ان گھروں ،محلوں اور بستیوں کی بناوٹ کی ساخت بالکل ہڑپہ سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس نے پورن سے شکوہ کیا کہ وہ لوگ کیوں ان کی بستیوں پر حملہ آورہوتے فساد پھیلاتے مار دھاڑ کرتے اور ان کے گھروں کو لوٹتے ہینجہاں وہ صدیوں سے آباد ہیں توپورن اس کا جواب یوں دیتا ہے؛

’’یہاں سے اس گھرکی چھت سے اگرمیں گھوڑے پر سوار ہوکر اسے ایڑھ لگاؤں تو وہ اس کی تنگ گلیوں پرسے پھلانگتا سارے گھروں کی چھتوں کو روندتا سندھوکےپاس جارکے گا تمہاری بستیاں ایسی ہیں اور تمہاری چھتیں ایسی ہیں اور تمہاری زمین ایسی ہے کہ اسے گھوڑے روند سکتے ہیں۔اس میں ہمارا دوش نہیں۔‘‘(۲۷)

اس اقتباس میں پورن نے دراصل ان بستیوں کے باسیوں کی سستی کاہلی اور

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

قدامت پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے اس کاخیال ہے کہ سمرو کی قوم نے وقت کے تقاضوں کے مطابق خود کو نہیں بدلہ ۔طرزِزندگی میں جدت لے کر نہیں آئے۔ اپنے گھروں ،اپنے کاشتکاری کے طریقو ں کو جدید نہیں بنایا لہٰذا ان کی تباہی بربادی میں ان کا اپنا قصور ہے۔ورچن کو اپنے دلائل سے پورن لاجواب کردیتا ہے۔ ورچن راستے میں آنے والے دریاؤں اور ندی نالوں کو عبور کرکے بستی میں واپس لوٹتا ہے تو ایک نیا بندہ جس کا ان کے سماج سے دور تک بھی تعلق نہیں اس کے ساتھ بستی میں آجاتا ہے۔ ورچن زندگی کی علامت ہے۔وہ اپنے سماج کے لیے سفر کرتا ہےاور آس پاس کے حالات و واقعات کی خبر لاتاہے۔

پورن اس ناول کا ایک اور اہم کردار ہے اس کا تعلق آریا نسل سے ہے۔ وہ ورچن کو اپنے بزرگوں کے بارے میں بتاتا ہے اور اس کی باتیں سن کر اپنی رائے دیتا ہے۔وہ ہرگز یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ اور اس کی نسل کے لوگوں کا اس دھرتی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ و ہ ورچن کو احساس دلاتا ہے کہ ورچن کے اجداد بھی ہمیشہ سے اس علاقے کے رہنے والے نہیں تھے بلکہ وہ بھی دروں سے گزر کران علاقوں میں آکر آباد ہوگئے تھے۔فرق صرف اتنا تھا کہ وہ لوگ بہت پہلے آکر آباد ہوئے تھے اور آریا بہت دیربعد یہاں وارد ہوئے۔

اقتباس دیکھئے:

’’اور بولو تم کہاں کے ہو؟ یہاں کے ہوتو کب کے ہو؟ جب یہاں کی سات ندیاں پہلی بار پہاڑوں سے اتریں اور انہوں نے میدانوں میں اپنا اپنا راستہ بنایا تو تم یہاں تھے؟ نہیں یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ تم بھی تو کہیں اور سے یہاں آنکلے تھے۔ بس ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ راستہ ہوتا ہے تو اس پر اور پاؤں بھی چلے آتے ہیں۔‘‘(۲۸)

پورن ایک حقیقت پسند انسان محسوس ہوتا ہے۔وہ اپنے مضبوط دلائل سے ورچن کے نقطہ نظر کوردکرتا ہے اور اپنی باتوں سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ یہاں پر ہمیشہ سے تو نہیں تھے بلکہ جب یہ سات دریا اس دھرتی پر پھیل گئے تو دنیا کے دیگر خطوں سے لوگوں نے یہاں آکر آباد ہونا شروع کیا۔ پورن نے نہ صرف کھلے دل سے ورچن کے گلے شکوے سنتا ہے بلکہ وہ اس کو مضبوط دلائل سے قابل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہاں کی قدیم بستیوں کے اجڑنے کا سبب ان کی کاہلی سستی اور آرام پسندی تھی۔ جنھوں نے قدرت کے نظام کے سامنے خود کو جدید نہیں بنایا۔زراعت وتجارت اور دفاع کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پورن کی باتوں میں کافی وزن ہے اور وہ جوحقائق بیان کرتا ہے آج کا مورخ تاریخی تحقیق کے بعد ان دلائل کوتسلیم کرتا ہے۔

’’ڈورگا‘‘ کا کردار بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زمانہ قدیم میں استحصالی شکنجے میں کسے ہوئے لوگوں کی علامت ہے۔ اس کی کہانی سے پتہ چلتا ہے کہ سامراجیت اور استحصالی نظام کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ ہزاروں سال سے انسانی معاشرے میں موجود تھا۔

’’وہ اور اس کے انگ سانگ جو پچھلے ہزار برس میں ان اینٹوں کو اپنے

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special

Online ISSN 3007-3197 | Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ہاتھوں سے بناتے تھے اور جسوں پر ڈھوتے تھے۔ کبھی بھٹے کی اونچی چاردیواری سے باہر نہیں گئے تھے۔انہوں نے اپنا پہلا اور آخری سانس اس کے اندر لیاتھا۔''(۲۹)

ایک ہزار سال سے یہ لوگ بھٹے کی اونچی چار دیواری سے باہر نہیں گئے تھے اور انہوں نے اس بھٹے سے باہر نکل نہیں دیکھا تھا اس ایک ہزار سال میں جس کسی نے بھی بھٹے سے نکل کر باہر نکلنے کی کوشش کی تھی آخر کو پکڑا جاتا تھا اور پھر بھٹے کے اندر اس قدر عبرتناک انجام سے دوچار کیاجاتا تھا کہ اس کی کئی نسلوں تک آئندہ کسی کو بھاگ نکلنے کی کوشش کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ڈورگا بھی یہ سب جانتاتھا لیکن اس نے رسک لیا اور وہ بھاگتا بھاگتا دریا پارکرکے موہنجوڈورو کی آبادیوں کے قریب جا پہنچا۔اس نے وہاں کی پکی اینٹوں کی عمارتیں دیکھیں تو اس کو احساس ہواکہ اس کی پکائی ہوئی اینٹوں سے یہ عمارتیں بنائی گئیں تھیں۔ اس نے ورچن اور پورن کودیکھا تو لک چھپ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بزرگوں کا تعلق بھی انہی لوگوں سے تھا جو کہ ویسی ہی بولی بولتےہوں گے جو پورن اور ورچن بولتے تھے،اور پھر وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر ورچن جس کشتی پرسوار ہوا اسی پر سوار ہوکردریا پارکرگیا،اور جب ورچن کواحساس ہواکہ کوئی اس کاپیچھا کرتا ہے تو اُس نے مڑکردیکھااور اس عجیب و غریب حالت کا شکار بوڑھے کودیکھا۔ا س کے حالات جاننے کے بعد اسے اپنے ساتھ بستی لے کر آیا۔

ڈورگا بستی میں آکر آہستہ آہستہ بستی کے لوگوں کے ساتھ رچ بس گیا ۔اس نے ان کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ پکلی نے اسے اپنے گھر رکھ لیا اور اسے دوسرے شوہر کا درجہ دے دیا۔ ڈورگا نے ایک بھٹی بنائی اس میں اینٹیں پکائیں اور پکی اینٹوں کا ایک کمرہ تیا ر کیا جیسا کہ اس نے موہنجو ڈارو میں دیکھا تھا۔ جب ورچن اس سے اپنے اندر کے خوف کے بارے میں بات کرتا ہے کہ اسوا والے آچکے اب وہ موہنجو کو برباد کردیں گے تو وہ یوں جواب دیتا ہے؛

''بستیاں باہر سے نہیں اندر سے مردہ ہوتی ہیں۔باہر والے تو اتنے برسوں سے چلے آرہے ہیں۔اگر موہنجوکوانہوں نے ختم کرنا ہوتا تو کرچکے ہوتے۔'' (۳۱)

اس پرورچن سوال کرتا ہے کہ یہ بستیانکیسے برباد ہوتی ہیں تو ڈورگا جواب دیتا ہے۔

''وہ لوگوں کے کڑھنے سے ہوتی ہیں....اندر ہی اندر بوڑھے مجھ ایسے اور بچے بھوکے اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے اور عورتیں ویسی جو میرے ایسوں کوجنم دیتی ہیں تو یہ سب کڑھتے ہیں کہ ہم کیوں ایسے ہیں اور اپنے اندر سے پوچھتے رہتے ہیں کہ ہمیں ہزاروں برس کی قید کیوں ہے ہم میں اور موہنجوکی پکی گلیوں میں دوڑنے والی گڈکے بیلوں میں بھی فرق کیوں ہے کہ وہ پیٹ بھر کرچارہ کھاتے ہیناور ہم نہیں کھاتے،اور انہیں جسوں پر تیل مل کر سندھو میں لشکاتے ہیں اور ہم نے کبھی سندھو دیکھا ہی نہیں۔''(۳۲)

ڈورگا ورچن کی اس استحصالی نظام جو قوموں اور تہذیبوں کی بربادی اور

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

تباہی کا باعث بنتا ہے کی مثال دیتے ہوئے اپنی بات یوں جاری رکھتا ہے؛

''ایک بستی باہر ہے موہنجو کی .....اور دوسری ادھربھٹے کے اندر ہے اور ان دونوں میں ایک میں اونچ بہت ہے اور دوسری نیچ بہت ہے.....جیسے تو جو ورچن ادھر میرے ساتھ وہاں کے کھنڈوروں میں آیا تھا اور اب جو ہے ریت میں دبا ہوا،آک کے پتے کھاتا چباتا اور تیرا بدن نیلا پڑتا ہے تو فرق ہے ناں۔یہی فرق ہے ہم میں اور باہر والوں میں۔''(۳۳)

ڈروگا کی کئی نسلیں اس استحصالی نظام کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔اس کی نسل کا ہربچہ جو اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا تھا بھٹے والوں کا مقروض شمار ہوتا ۔

اس سے یہ نتیجہ بھی اخذہوتا ہے کہ یہ جو استحصالی نظام عالمی سامراج نے دنیا بھر پر مسلط کررکھا ہے یہ انسانی آبادیوں پر مسلط کیاجانے والا پہلا استحصالی نظام نہیں بلکہ اس استحصالی نظام کی تاریخ بہت پرانی ہےڈروگا کاکردار اس نظام کےمکروہ فعل سے پردہ ہٹاتا ہے ناول نگار نے اس کردار کو موجودہ استحصالی نظام کی بنیادوں کی تلاش کے لیے استعمال کیا ہے۔

دھروا اس ناول کا ایک ایسا کردار ہے جو مذہبی نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ گاگری کا خاوند تھا اور اس کی بیوی ہر سال ایک بچہ جنتی تھی لیکن وہ پیدائش کے بعد مرجاتا ۔دھروا آخر کا ر جنسی قوت سے محروم ہوتا گیا ۔تو اس نے مذہب سے لو لگالی۔وہ مقدس کا رکھوالا ہے اور ان کو پانی اور چارہ فراہم کرنے کی ذمہ داری پر مامور ہے۔ زینوبیلوں کو اس تہذیب میں اتنا مقدس مانا جاتا ہے کہ وہ لوگ ان کا پیشاب مقدس اور بیماریوں کا علاج سمجھتے ہیں اور پیتے ہیں۔ان مقدس بیلوں کا گوشت حرام ہے،کیونکہ ان کے نزدیک یہ بیل اتنے مقدس ہیں کہ اگریہ بیل مربھی جائیں تو بھی ان کی تعظیم ضروری ہے،لیکن جب قحط سالی کا آغاز ہوتا ہے اور یہ بیل مرنے لگتے ہیں تو بستی کے بھوکے لوگوں کے لیے یہی بیل خوراک کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ دھروا جوکہ پہلے لوگوں کو ان بیلوں کا گوشت کھانے سے منع کرتا تھا یہ کہہ کر گوشت کھانے لگتا ہے کہ میں بھی کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔ اس واقعہ سے یہ تاثرملتا ہے کہ بھوک تہذیبوں کے سارے آداب مٹا دیتی ہے،اور غربت کے اثرات جب پھیلتے ہیں تو مذہبی عقائد کی حیثیت ماندپڑجاتی ہے اور پیٹ ہی سب سے بڑامذہب قرار پاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں ناصرف عنوان، پلاٹ اور کرداروں کی پیشکش میں نہایت زبردست مہارت ثابت کی ہے بلکہ انہوں نے مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کے بھی لاجواب نمونے پیش کیے ہیں ۔

ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں؛

''تم بھیگتی کیوں ہو.....سمرو نے اسے ٹٹولا اور کہا او راونگھ گیا۔سمرو مجھے دیکھ کر بتا وہ بیل بوٹے جو پکلی نے میرے جسے پر الیکے تھے ویسے ہی ہیں یا پھیکے پڑگئے ہیں۔''(۳۴)

حالانکہ وہ ورچن سے مخاطب تھی لیکن اس نے بے خیالی میں نام سمرو کا

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

لیاتھا اور اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ ورچن نا سن سکا ۔ پاروشنی دراصل دو کشتیوں میں سوار تھی کہ اس کے لیے یہ تفریق کرنا نہایت مشکل تھا کہ کون تھا ان میں سے جس سے وہ زیادہ محبت رکھتی تھی لیکن وہ ان کے درمیان فرق نہ کرپاتی ۔اب ورچن سے شادی کے بعد بھی دو کشتیوں میں سوار تھی اور اس نے سمرو سے جسمانی تعلقات ختم نہ کیے تھے۔

منظرنگاری کے بھی اس ناول میں بہت عمدہ نمونے سامنے آتے ہیں۔

’’پاروشنی نے بوٹے کو سونگھا اور پھراپنا دایاں کان پانی کے ساتھ لگا کر سانس روکا ،تاکہ وہ دریا کے بولنے کو سن سکے۔ پر ابھی وہی سرسراہٹ تھی پانی کے کم بہنے کی اور کچھ نہ تھا۔‘‘(۳۵)

جب کافی مدت تک پانی نہیں آئے تو گاؤ ں والو نکی بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پاروشنی بھی پانی کے انتظار کی منتظر تھی ،اور جب اس نے مخصوص انداز میں دریا کے پانی کے ساتھ کان لگا کر بڑے پانیوں کی آمد کے بارے اندازہ لگانا چاہا تو اسے شدید مایوسی ہوئی وہ اندر سے جان چکی تھی کہ اب بڑے پانی نہیں آئیں گے۔ لیکن وہ یہ بات منہ سے نہیں نکالنا چاہتی تھی۔

مستنصرحسین تارڑ کے اس ناول سے ہمیں ماضی کی تاریخ کے کئی ایک پہلوؤں سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ان میں سب سے پہلا پہلوزمانہ قدیم ما قبل مسیح کے ان لوگوں کی خوراک، لباس اور طرززندگی ہے۔ یہ لوگ دریاؤں کے کنارے بستیاں قائم کرتے تھے، اور سادہ خوراک کھاتے تھے ۔ان کے مکانات بھی سادہ لیکن منظم انداز میں بنے ہوتے تھے۔ کاشتکاری کے لیے ان کے ہاں جوطریقہ رائج تھا اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے کھیت سانجھے ہوتے تھے لیکن سہولت کی خاطر وہ ان کو آپس میں اس طرح بانٹ لیتے تھے کہ کاشتکاری کرنا آسان ہوجائے۔ جس کے حصے میں جتنا کھیت آتا وہ اس کوپوری محنت سےزراعت کے لیے ہموار کرتا اور بڑےپانیوں کی آمد سے پہلے ان میں بیج ڈالتا تھا،تاکہ جب بڑے پانی آئیں اور پانی دریا کے کناروں سے نکل کر کھیتوں میں آئے بیج پھوٹنے کا عمل شروع ہوسکے۔

وہ یہ عمل کئی صدیوں سے کرتے چلے آرہے تھے۔ ان کے پاس زمین کھودنے کے لیے لکڑی ،پتھروں اور دھاتوں کے بنے اوزار تھے۔ کسی اور کدالوں کی مدد سے وہ زمین نرم کرکے اس میں بیج ڈالتے اور پھربارش یادریا کے پانی کا انتظار کرتے تھے ،یعنی ان لوگوں کا آبپاشی کا نظام بالکل غیر ترقی یافتہ تھا،اور انہوں نے کاشتکاری کے فن کو زیادہ ترقی نہیں دی تھی۔

یہی وہ وجہ تھی جس کی وجہ سے وہ بارش اور بڑے پانی کے نہ آنے کی صورت میں خوراک کی کمیابی کا شکار ہو جاتے تھےلیکن ان کے ہاں وافر مقدار میں خوراک جمع ہوتی تھی جو چند سالوں کابحران کاسامناکرنے میں مدد کر سکتی تھی۔ لیکن اس بستی کی تباہی کاسبب یہ تھا کہ مسلسل بہت سے سالوں تک نہ توخاطرخواہ بارشیں ہوئیں اور نہ ہی دریامیں پانی کی مقدار بڑھی ۔الٹا پانی کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا جس کے نتیجے میں فصلیں تو ختم ہوئیں ساتھ ہی جنگلات اور نباتا ت

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

کو بھی شدید نقصان پہنچا حتیٰ کہ جھیل کا پانی خشک ہوگیا اور بستی میں پانی کا واحد کنواں بھی خشک ہوگیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے حالات وواقعات کو نہایت معلوماتی انداز اور حقائق کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ماضی میں انسانی آبادیوں کو درپیش مسائل سے متعلق حقیقت پر مبنی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

انسان اپنی جنم بھومی سے اپنی مٹی سے کتنا پیارکرتا ہے اور اس کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہےاس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب خشک سالی اور قحط کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں کے چہروں پر موت کے سائے لہرانے لگتے ہیں ، لیکن وہ اس خیال سے روندھ جاتے ہیں کہ آخر ان کو اس بستی کوچھوڑ کرکسی اور جگہ زندگی کے لیے موافق ماحول تلاش کرنا ہوگا۔

’’کنویں میں بھی تو پانی کم ہورہا ہے تو کیا ہوا......ہماری فصلیں نہیں ہیں تو کیا ہوا......ایسا پہلے بھی تو ہوا ہوگا ،اور بستی والوں نے وہ وقت گزارہ ہوگا۔کسی نے کسی حیلے سے......اگر نہ گزارہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے۔ تو ہم بھی ذرا بھوک کاٹ کے بے آرام رہ کر یہ وقت کاٹ لیتے۔‘‘(۳۴)

پاروشنی جو کہ اپنی دھرتی سے بے پناہ محبت کرتی تھی چاہتی تھی کہ بستی کے رہنے والے مایوس ہوکربستی چھوڑ کرنہ جائیں اور وہ اس کے لیے کئی ایک دلیلیں دیتی ہے لیکن بستی کے سارے لوگ آخر بستی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور سمرو،پاروشنی اور ڈروگا باقی رہ جاتے ہیں۔لیکن آخرکار یہ سب لوگ عبرتناک انجام کوپہنچتے ہیں لیکن اپنی دھرتی سے محبت کی لازوال مثال چھوڑجاتے ہیں۔

اس بستی کے لوگوں کے رسم ورواج کاجہاں تک تعلق ہے یہ جاننا بھی حیران کن ہے۔ ان لوگوں کے ہاں کئی ایک توہمات بھی پائی جاتی ہیں اور ان کا مذہب غالباًبدھ مت ہے ،یہ لوگ دیوی دیوتا پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی مورتی بناتے ہیں اور ان کو مقدس جان کر ان کی پوجاپاٹ کرتے منتیں مانگتے۔ چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔اس کے علاوہ دریا کو بھی آقا کادرجہ دیتے ہیں جن کے متعلق ان کو یقین ہے کہ اگر دریا روٹھ جائے تو اس کاپانی سوکھ جاتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی ایک دیوی ہے جس کے لیے کچھ بیل مقدس قرار پاتے ہیں جن کا گوشت ان پر حرام ہے اور یہ بیل اتنے مقدس ہیں کہ گاؤں کے لوگ اپنی اپنی جگہ چارہ کاٹ کر ان کو ڈالتے ہیں تاکہ وہ مصیبتوں سے دور رہیں۔ لیکن جب مسلسل کئی سالوں تک قحط اور خشک سالی برقرار رہی لوگوں کی منتیں،صدقے اور دعائیں کسی کام نہ آئیں تو لوگوں کا اعتقاد اُٹھ گیا انہوں نے نہ صرف زیبو بیلوں کو کھانا شروع کردیا ،لنگ کے ٹیلے پر لنگ کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔

ہزاروں سال پرانی ان بستیوں کے رہن سہن ،طرزِتعمیر،لباس،خوراک ،ذرائع آبپاشی،تہذیب و تمدن کی کئی ایک پرتیں کھولتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ نے یہ احساس دلایا ہے کہ انسانی زندگی اس کرۂ ارض پر مسلسل اپنی بقا کی جنگ لڑتی رہی ہے اور انسانی بستیاںآباد اور برباد ہوتی رہی ہیں۔ماحول اور حالات لوگوں کی عادات، رسم ورواج اور رہن سہن پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اگر انسان کو خوراک اور رہائش کی بہترین سہولتیں آسانی سے میسر آجائیں تو انسان سست اور

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

کاہل ہوجاتا ہےاور اس کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قوت کمزور ہوجاتی ہے۔

اگرانسان اپنے بزرگوں سے حاصل ہونے والے قدرتی وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کرتے اور ان طریقوں کو جدیدخطوط پر استوار کرتا رہے تو اس کی آئندہ نسلوں کی بقاممکن ہوجاتی ہےورنہ آخرکار ماحولیاتی تغیرات کے اثرات کاشکار ہوکر انسانی تہذیبیں تباہ وبرباد ہوجاتی ہیں۔ جیسا کہ پورن نے ورچن کوتنبیہ کی تھی کہ ان بستیوں کے لوگ کاہل اور سست ہوچکے ہیں لہٰذا تباہی اور بربادی ان کا مقدر ہے ویسا ہی ہوا۔ پانی کی مقدار کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی لیکن وہ اس نظام کانہ تو متبادل تلاش کرسکے اور نہ ہی بروقت ہجرت کرکے متبادل ذرائع کا حصول ممکن بنا سکے۔نتیجہ مکمل تباہی کی صورت میں سامنے آیا۔

ظروف سازی ہمیشہ سے انسانی تہذیب کا ایک اہم مشغلہ رہا ہے۔ظروف یا برتن انسانی استعمال کی نہایت اہم چیزوں میں سے ہیں۔آثارِقدیمہ نے ہندوستان میں جوقدیم تہذیبیں دریافت کی ہیں اُن سب تہذیبوں میں ظروف سازی کے نہایت عمدہ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں قاری کو ان قدیم تہذیبوں کے فنی کمالات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ ایسے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں جن میں مختلف انسانی استعمال کے برتن،فن مصوری کے شہکار نمونے ،کھیتی باڑی کے لیے استعمال ہونے والے اوزار اور کاروبار کرنے لیے منکے اور لہروں کے استعما ل پر روشنی پڑتی ہے؛

’’وہ کیا ہے جو آوے میں پک سکتا ہے پروہ برتن نہیں ہے......جھجھر، صحنک ، گھڑا، چاٹی، چھونی،کُنی، ڈولا،گڈوا، جھانواں،توے یامرتبان کے سوا اور کیا ہے جو آوے پر پک سکتا ہے؟‘‘(۳۷)

یہ وہ برتن ہیں جو عموماًآوے پر پکائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں تھیں جو بنائی جاتی تھیں ۔ بچوں کے کھلونے،مہریں،چھوٹے چھوٹے بت اور منکے سب چیزیں ۔ورچن دعویٰ کرتاہےکہ آریاؤں نے یہ سب چیزیں یہاں کے مقامی باشندوں سے بنانا سکھیں۔ ورنہ وہ ان چیزوں کے بارے میں پہلے کچھ نہ جانتے تھے۔ ناول کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ناول کے آغازسے اختتام تک مسلسل ایک غمناک فضا اور تہذیبوں کے ملیامیٹ ہونے کا کرب مسلسل نمایاں رہتا ہے۔ اور قاری کی توجہ ان غمناک تہذیبی بربادیوں کے اسباب کی طرف رہتی ہے جو اس کے مٹنے کا سبب بنے ،اور استحصالی نظام کی بازیافت قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ استحصالی نظا م انسانی تاریخ کے ہر دور میں موجود تھا البتہ ہر دور میں اس کی تنظیم اور ڈھانچہ مختلف تھا ۔لیکن طریقہ کار اور مقاصد میں یکسانیت نظر آتی ہے۔

انسانی کرداروں اور تہذیب وتاریخ کی پیشکش کے علاوہ اس ناول کا جوسب سے اہم موضوع ہے وہ ہندوستان کے قدیم دریا ہیں۔ان دریاؤ نمیں گھاگھرہ کوبنیادی حیثیت حاصل ہے اسے باکڑہ، گھاگھرا، سرسوتی اور ہاکڑہ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دریا کے سوکھنے سے اس کے کنارے آباد سادہ دل زندگیوں پر نہایت بھیانک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس دریا کی

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)

International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special

Online ISSN 3007-3197 | Print ISSN 3007-3189

http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

زبردست تصویر کشی کی ہے۔ یہ ناول ایک طرح سے ایک غیر روایتی انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ جس بستی کو مصنف نے موضوع بنا یا ہے اس دریا کنارے آباد دیگر بستیوں کی طرح اس دریا کا پانی ہرسال آکر اس کو سیراب کرتا تھا۔ ناول میں آغاز سے ہی ایسے اشارے ملتے ہیں کہ بستی کے باسی کئی سالوں سے محسوس کررہے تھے کہ دریا کا پانی خشک ہو رہا ہے،اور ناول کی پوری کہانی کے دوران وقفے وقفے سے ناول نگار نے ایسے واقعات پیش کیے ہیں جن سے پانی کی مقدار کے مسلسل کم ہونے کے اثرات بستی والوں پر نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گھاگھرا کے پانی کا خشک ہونا دراوڑی تہذیب کے زوال کا سبب بنا۔

اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ نے جنوبی پنجاب کی اس تہذیب کو کئی ایک پہلوؤں سے موضوع بنا یا ہے۔ اسی وجہ سے اس ناول کی اپنی ایک قدروقیمت ہے۔ بچوں کی پیدائش اور انسانوں کی موت کے بعد ان کی تدفین تک کے حالات و واقعات ،رسومات اور مذہبی عقائد کوانہوں نے اس ناول میں بڑی اہمیت دی ہے۔ اس پرانی تہذیب میں موت کے لفظ کااستعمال نہ تھابلکہ جس کی سانس بندہوجاتی تھی اس کے بارے میں تصور قائم کیا جاتا تھا کہ اس فرد کو یم کے کتے لے گئے ہیں۔ آوے پر کچھ خاص قسم کےمرتبان تیار کیے جاتے تھے جن میں مرنے والے کے مردہ جسم کو ڈال کرجنگلوں میں جاکر دفن کردیا جاتا اور اس کےسرہانے ایک یادگاری پتھر بھی رکھ دیا جاتا تھا۔

ایک اور اہم چیز جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ جب کوئی انسان انتہائی بوڑھا ہوجاتا اور بڑھاپے کی تکالیف ناقابل برداشت ہو جاتی تھیں تو ان لوگوں کو رُکھوں(جنگلوں) میں بھیج دیا جاتاجہاں وہ موت کا انتظار کرتے تھے۔ موجودہ عہد میں اولڈایج ہومز کا تصور شاید اس روایت کی ارتقائی شکل ہے۔ ہمارے سماج میںآج بھی خاص طور پر محرم کے موقع پر قبروں پر پانی ضرور ڈالا جاتا ہے۔ اس ناول میں بھی اس قدیم تہذیب میں قبرستان جانے والوں کے لیے لازم تھا کہ وہ ان مردوں پر پانی ڈالتے تھے۔

خشک سالی جب عروج پرپہنچتی ہے تو گاؤں کے لوگ جنگلی درختوں کے پتوں کو خوراک کے طورپر استعمال کرتے ہیں۔ جنگلی درختوں کے پھل بھی ان کو ایک نعمت لگنے لگتے ہیں۔یعنی مجموعی طورپر کہاجاسکتا ہے کہ یہ ناول قبل مسیح کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کی نہ صرف بازیافت ہے بلکہ اس قدیم دور کی بعض روایات اور توہمات کی موجودہ دور میں جدید شکلوں کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

Annual Methodological Archive Research Review
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about
Volume 3, Issue 7.1 (2025)
International Conference on Computer Science, Management, and Social Sciences (ICCSMSS-2025) -Special
Online ISSN 3007-3197 Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

حوالہ جات

ممتاز احمد خان ، ڈاکٹر ، آزادی کے بعد اردو ناول ، انجمن ترقی اردو کراچی ، ۲۰۰۸ء صفحہ۱۹۸۔

ناہید قمر ، ڈاکٹر ، اردو فکشن میں وقت کا تصور ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ، ص ۱۸۲

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقاء (۱۸۵٤-۱۸۵۷)ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۲۰۰۸ ص ۳۰/۳۱

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ ، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور۱۹۹۲ ص ۹

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقاء (۱۸۵۷-۱۹۱٤)، ص ۳۲

تارڑ،مستنصر حسین تارڑ ، بہاؤ ، ص۱۱٦

یوسف نون، مضمون نگار، بہاؤ ایک ماحولیاتی پڑھت۔ مثولہ: ادبیات اسلام آباد شمار نمب،۱۲۳/۱۲٤ جنوری تا جون ۲۰۲۰ ، ص ۲۷۹

ایضاً، ص ۲٦٦

ایضاً ، ص ۲٦۸

صدیق طاہر، وادی ہاکڑہ اور اس کے آثار ، اردو اکیڈیمی بہاولپور1993، ص ۹

ایضاً، ص ۹

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ص ۱۹۷

ایضاً ، ص ۱۹۷

ایضاً، ص۲۲۷

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقاء (۱۸۵۷-۱۹۱٤) ، ص ۳۸

انٹرویوhttp/urdufiction.com

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ ، ص ۹

ایضاً، ص۹

Online ISSN 3007-3197
Print ISSN 3007-3189
http://amresearchreview.com/index.php/Journal/about

ایضاً، ص ۱۱٦

ایضاً، ص۱۲

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقاء (۱۷۵۷-۱۹۱٤)، ص ۳۷

مستنصر حسین تارڑ ، بہاؤ ، ص۱۳

ایضاً، ص ۱۹

http/urdufiction.com

مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ ، ص۱۷

ایضاً، ص۲٦

ایضا ، ص٤۲

ایضا ، ص٦۰

ایضا ، ص٦۰

ایضا ، ص۲۹

ایضا ، ص۹٦

ایضا ، ص۹٦

ایضا ، ص۹٦

ایضا ، ص۱۲۹

ایضا ، ص۲۰٤

ایضا ، ص۲۳۰

ایضا ، ص۱۷۰